Regd. L. No.7243

Phone, 808

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1968

سچے موتی

حضورؐ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز نہ بتاؤں جو نماز
روزہ اور زکوٰۃ سے بھی افضل ہے

صحابہؓ نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا تو حضورؐ نے فرمایا کہ وہ ہے

باہمی تعلقات کا درست رکھنا

(ابوداؤد)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اُسے کوستے نہیں۔ یہ کتاب دیجیے اور پھر دیکھیے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ [illegible]
جلد آٹھ روپے دوسری و تیسری جلد
[illegible] روپے فی جلد

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔
عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

عہد آفریں کتابیں

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، بلکہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ پچپن روپے میں۔

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات و مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے اُبھر کر سامنے آگئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ - آٹھ روپے
جیبی ایڈیشن - چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام
بی/۲۵۔ گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
پاکستان ۔ ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ

شرح اشتراک
سالانہ پاکستان ـــــ دس روپے
سالانہ ہندوستان ـــــ پندرہ روپے
سالانہ غیر ممالک ـــــ ایک پونڈ

نمبر (۷) | جولائی ۱۹۶۸ء | جلد (۲۱)

فہرست

۱۔ لمعات ـــــ ۲
۲۔ طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد ـــــ ۷
۳۔ پیغامبر انقلاب ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۹
۴۔ حقائق و عبر ـــ نماز کے بدلے میں لڈو ـــ (ظلم خانہ خدا) ـــ (مولوی صاحب کا درس قرآن) ـــ ۲۹
۵۔ یورپ کا عالمی کردار ـــــ (محترم خورشید عالم صاحب) ـــــ ۳۳
۶۔ باب المراسلات ـــ (پیری مریدی کا زور) ـــ (چند اہم سوالات۔ مسلمان اور ملّی ادارے۔ حکومت سے تعاون۔ یادگار پاکستان) ـــ (پرویزی (فکر) کون سا ہے؟) ـــ (مومن اور مسلم) ـــ (کیا ناجائز جائز ہو سکتا ہے؟) ـــ (سپاہی کا مقام) ـــ ۴۱
۷۔ ہمیں نے اس درس سے کیا پایا؟ ـــــ (محترم محمد اسلام صاحب) ـــــ ۵۷
۸۔ رابطۂ باہمی ـــــ ۶۴
۹۔ صحیح ناپ تول ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۶۶
۱۰۔ منکرین حدیث کون ہیں؟ ـــــ (محترم ابوشہاب رفیع اللہ صاحب) ـــــ ۷۰
۱۱۔ نقد و نظر ـــــ ۷۷

ایڈیٹر۔ محمد خلیل، ناشر۔ سراج الحق، مقامِ اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور، پرنٹر۔ شیخ محمد اشرف، مطبوعہ۔ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دینی اور لادینی سیاست

سیاست کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دینی سیاست جس کا علمبردار اسلام ہے۔ اور دوسری لادینی سیاست (جسے سیکولر بھی کہتے ہیں اور) جو یورپ کی خدا فراموش اقوام کا عام مسلک ہے۔ دینی سیاست کی بنیاد خدا کے اس ارشاد پر ہے کہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۔ لَآ مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)

تیرے رب کی بات سچائی اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئی۔ اب ان باتوں کا بدلنے والا کوئی نہیں۔

یعنی دینی سیاست کا مدار خدا کے متعین کردہ ان اصولوں پر ہے جو غیر متبدل ہیں — جن میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے برعکس مغرب کی لادینی سیاست کی اساس اٹلی کے مشہور مدبر میکیاولی کے اس نظریہ پر ہے کہ:

صحیح حکمت عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمتِ عملی یہ ہے کہ حسبِ موقعہ جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے اسے اختیار کر لیا جائے۔

پاکستان میں جماعتِ اسلامی کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ یہاں صحیح دینی نظام قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے اس کی سیاست دین کی بنیادوں پر استوار ہے۔ یہ جماعت اپنے اس دعوے میں اس قدر متشدد ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی سیاست کی علمبردار صرف وہی جماعت ہے اور اس جماعت کے سربراہ سید ابوالاعلیٰ مودودی اس نظریہ کے واحد نقیب ہیں۔ آج کی نشست میں ہم دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے۔ کیا وہ دینی سیاست کے نقیب ہیں یا مغرب کی ابلیسی سیاست کے علمبردار جس کے اصول ہر مصلحت

کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سردست ہم ان کی بساطِ سیاست کے صرف ایک گوشے کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔ اور یہ گوشہ وہ ہے جو آجکل ان کی تمام سرگرمیوں کا محور ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس مقصد کے حصول کے لئے وقف کر رکھا ہے اور وہ مقصد جس کے لئے انہوں نے ملک گیر مہم شروع کر رکھی ہے وہ یہ ہے کہ:

ملک میں جمہوری نظام قائم کیا جائے

وہ ہر جگہ اس کا اعلان کرتے پھر رہے ہیں کہ ملک میں جمہوری نظام ہی سے اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے (اور جمہوری نظام بھی ان کے تصور کا جس میں ہر بالغ کو رائے دینے کا حق ہو اور وہ پارلیمان کے ممبروں اور صدرِ مملکت کے انتخاب کے لئے براہ راست ووٹ دے سکے)۔ وہ اس سلوگن کو بار بار دہرائے جا رہے ہیں کہ اسلام اور جمہوریت لازم و ملزوم ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک جمہوریت، اسلام کا غیر متبدل اصول ہے۔ اور اس کے خلاف ہر تصور غیر اسلامی۔ حتیٰ کہ جو جمہوریت ان کے تصور کے مطابق نہیں، وہ بھی غیر اسلامی ہے۔

جمہوری نظام کی تفاصیل طول طویل ہیں لیکن اس کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ملک کی آبادی کی اکثریت جو فیصلہ کرے، اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ اور (ظاہر ہے کہ جب) اس نظام کو عین مطابقِ اسلام قرار دے دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ملک کی آبادی کی اکثریت جو فیصلہ کرے، اسے اسلامی سمجھا جائیگا۔

ہم اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ صحیح اسلامی نظام کیا ہے اور مغربی جمہوریت کا اس سے کیا تعلق ہے۔ ہم اس وقت صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ جس جمہوری نظام کو مودودی صاحب اب عین اسلام قرار دے رہے ہیں، اس سے پہلے اس کے متعلق ان کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے غور سے دیکھئے گا۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت جو فیصلہ دے دے، مودودی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ وہ فیصلہ حق و صداقت پر مبنی سمجھا جائے گا اور عین مطابقِ اسلام قرار پائے گا۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ مسلمانوں کی اس اکثریت کے متعلق وہ اس سے پہلے کیا فرماتے تھے۔ انہوں نے اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن کی محرم ۱۳۶۰ھ کی اشاعت میں لکھا تھا۔

> یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو جو مسلمان نام ملتا چلا آرہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق

سب ان کر قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت سالے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ۔ صفحہ ۲۷)

دوسری جگہ انہوں نے لکھا تھا کہ ان مسلمانوں کی اکثریت کو "اسلامی" کہنا ہی غلط ہے۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں ان کی "کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے"۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ "سوادِ اعظم" کا ہمیشہ ساتھ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ارشادِ نبویؐ کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو۔ جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔ اور اگر وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جائے تو اس پر زیادہ دیر تک کبھی نہیں رہ سکتی۔ اس بنا پر حضورؐ نے سوادِ اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی ہے۔ مگر جو لوگ ان ضروری صفات سے عاری ہیں اور جن میں کھرے اور کھوٹے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو، ان کے ہلڑ کا نام ہرگز اسلامی سوادِ اعظم نہیں ہے، نہ ان کی جماعت، اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے، نہ ان کی امارت اسلامی اصطلاح کی رُو سے امارت ہے، نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے سمع وطاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی، ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔

(ترجمان القرآن۔ بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۷۲)

وہ مسلمانوں کی اس اکثریت کو مسلمان کہنا تو درکنار، انسانوں کا درجہ دینے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ وہ انھیں

"چڑیا گھر کے جانور" کہہ کر پکارتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ترجمان القرآن بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں لکھا تھا۔

غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ص ۲۷)

ان مسلمانوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ:

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت۔ چوری۔ زنا۔ جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لئے جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے مؤکل کی پیروی کرتے ہوئے اتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پا کر یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پا کر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا یا فوجی تربیت سے ان میں بھیڑیئے کی درندگی پیدا کرنا جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لئے تو ضرور مفید ہو سکتا ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون ان کی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا۔ کس کی نگاہیں اس کے سامنے عزت سے جھکیں گی۔ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لئے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

اس قسم کی قوم میں سے جو نمائندے منتخب ہوں گے اور وہ جس قسم کی حکومت قائم کریں گے، اسے مودودی صاحب مسلمانوں کی کافرانہ حکومت قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے محولہ بالا رسالہ میں تحریر فرمایا تھا۔

جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ عام انتخاب میں انکے

ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہوں گے جو منہاجِ نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں
جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر
دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلیگا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا
ہوگا۔ اسی طرح اگر سوسائٹی بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر
برسرِ اقتدار آئینگے جو اس سوسائٹی کی خواہشاتِ نفس سے سندِ قبولیت حاصل کر
سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت
کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ
الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل
ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اس پاک
نام کو ذلیل کرنا ہے۔ (ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ صد ۲۹)

آپ نے غور فرمایا کہ مسلمانوں کے منتخب کردہ نمائندوں پر مشتمل حکومت کے متعلق مودودی صاحب کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اسے "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" قرار دیتے تھے۔

اب وہی قوم ہے، وہی مسلمان ہیں، وہی ان مسلمانوں کی خصلتیں ہیں، وہی ان میں برائیاں ہیں۔ لیکن اب مودودی صاحب کا "اسلام" کچھ اور کہتا ہے۔ اب ان کے "اسلام" کا فیصلہ یہ ہے کہ انہی مسلمانوں کے نمائندوں کی اکثریت سے جو حکومت قائم ہوگی، وہ عین اسلامی حکومت ہوگی بشرطیکہ وہ نمائندے ان کے ٹکٹ پر منتخب ہوں۔ اگر اسی قوم کے نمائندے کسی اور کے ٹکٹ پر منتخب ہونگے، تو ان میں تمام خرابیاں اور برائیاں بدستور باقی رہیں گی۔ اگر وہ ان کے ٹکٹ پر منتخب ہوں گے تو وہ انسان نہیں فرشتے بن جائیں گے اور ان کی قائم کردہ حکومت کافرانہ نہیں عین مومنانہ قرار پائے گی۔ حتیٰ کہ ان نمائندوں کے لئے مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں۔ اگر وہ ہندو بھی ہوں گے تو بھی، مودودی صاحب کے نزدیک، وہ اسلامی نظام کے علمبردار سمجھے جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے سالقہ الیکشن کے سلسلے میں فرمایا تھا کہ

اگر کونسٹی ٹیوشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعت (اسلامی) اس کی
حمایت نہیں کرے گی کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں۔ لیکن اگر ایک
ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ اس
نے اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریئے کے مطابق ہونا چاہیئے
(بحوالہ امروز ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرمایئے کہ مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی سیاست، دینی سیاست ہے جس کے اصول کبھی بدلا نہیں کرتے، یا مغرب کی لادینی سیاست جس کے اصول مصلحت کے تابع بدلتے رہتے ہیں اور جسے خود مودودی صاحب ابلیسی سیاست قرار دیتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد

ہم سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ طلوعِ اسلام کی تحریک کا مقصد اور مسلک کیا ہے۔ اسے ہم اس سے پہلے بھی کئی بار بیان کر چکے ہیں لیکن مختصر الفاظ میں پھر دہرا دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

(۱) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے۔ خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

(۲) قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رُو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض (یا نظامِ مملکت) کہتے ہیں۔ قرآن کی رُو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

(۳) قرآن نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔

(۴) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے نظامِ قرآنی قائم کیا اور اپنے رفقائے کار (صحابہ کبارؓ) کے مشورہ سے قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔

(۵) رسول اللہ کے بعد دین کا یہی نظام، حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا جو امورِ ملت کو ملت کے مشورے سے سرانجام دیتے تھے۔ قرآن کے جن اصولوں کی جزئیات اس سے پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں، انھوں نے ان کا تعین کیا۔ جن میں کسی ردّوبدل کی ضرورت تھی ان میں ضروری تغیر و تبدل کیا۔ جن میں ایسی ضرورت نہیں تھی انہیں علی حالہٖ باقی رکھا۔

(۶) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا قرآنی نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا جس میں ہم اس وقت تک مبتلا ہیں۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے اسی انداز کا نظام قائم کیا جائے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائے۔

(۷) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا، امت کے مختلف فرقے، مختلف جزئیات پر جس جس انداز سے عمل پیرا ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا ردّوبدل کرے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام کو پہنچتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر پھر سے امت میں وحدت پیدا کرے۔ اس دوران میں اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دین کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور ہم میں جو عقائد و رسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں، ان کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ جو لوگ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ اپنی اصلاح کرتے چلے جائیں۔

(۸) قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا نہ قرآن کے بعد

خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آسکتی ہے نہ رسول اللہ کے بعد کوئی اور نبی یا رسول۔

(۹) قرآن کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماورا۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ کے علوم و فنون جس حد تک ترقی کر چکے ہیں وہ انسان کے سامنے ہوں اور چونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ تمام کائنات انسان کیلئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اسلئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر لابدی ہے۔

(۱۰) نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرفِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ کی مظہر تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری کتب روایات و تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہو گئی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ آپؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک دھبہ ہے اور حضورؐ کی طرف غلط منسوب۔ ضرورت ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے صحن چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔

(۱۱) ہم دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں اس لئے ہم کوئی فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ نہ ہی ہم نے کوئی نئی قسم کی نماز ایجاد کی ہے نہ روزوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ نو دن کے ہیں۔ احکامِ اسلامی کے متعلق البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کی پابندی محض ایک رسم کے طور پر نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ان کی روح پر بھی نگاہ رکھنی چاہیئے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے، اور اس کے بعد کی زندگی میں شرفِ انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

(۱۳) قرآنی نظام میں تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے۔ اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں۔ یاد رہے کہ یہ تصور کمیونزم کے تصور سے یکسر مختلف ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہ سرمایہ داروں کے لئے خوش آیند ہو سکتا ہے نہ کمیونسٹوں کے لئے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں دین کے متعلق وہ نظریات و تصورات جنہیں ہم ایک عرصہ سے قوم کے سامنے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ملک میں ایسی فضا تیار کی جائے جو قرآنی نظام کی تشکیل کے لئے سازگار ہو اور جب اس نظام کی ابتدا اس خطۂ زمین میں ہو جائے تو پھر اس کی حدود کو وسیع کرتے جائیں تاکہ اس طرح آہستہ آہستہ ساری زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ اور جس مقصد کے لئے قرآن دنیا میں آیا تھا وہ مقصد پورا ہو جائے۔

یہ ہے ہمارا مسلک اور مقصد۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا پروپیگنڈا ہے جو خاص مقصد کے لئے کیا جاتا ہے۔

آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ ؐ است

پیغامِ انقلاب

۱۰ رجون ۱۹۶۸ء کو عید میلاد النبی ؐ کی تقریب پر

وائی - ایم - سی - اے ہال لاہور میں

پرویز صاحب کا خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیغامِ برِ انقلاب

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

ربیع الاول کا مقدس مہینہ، نور و نکہت کی ہزار جنت سامانیاں اپنے جلو میں لئے، پھر وجہ تابانیٔ عالم ہوا۔ جیسا کہ میں نے ایک دفعہ اسی تقریب کے سلسلہ میں کہا تھا، میرے نزدیک، ہمارے ہاں جشنِ مسرت کے تیوہار دو ہی ہیں۔ ایک جشنِ نزولِ قرآن کہ جسے عید الفطر کہا جاتا ہے، اور دوسرا عید میلاد النبیؐ۔ اور اصل یہ ہے کہ یہ دونوں تیوہار بھی ایک ہی سکّے کے دو رُخ اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ قرآن حروف و نقوش میں خدا کا کلام ہے، اور سیرتِ صاحبِ قرآن خود قرآن کی محسوس تعبیر اور درخشندہ تفسیر۔ سیرتِ طیبہ کی یہی اہمیت تھی جس کی وجہ سے اس کے اصولی گوشوں کو خود قرآن نے اپنے دامن میں محفوظ کر کے اسے ابدیت در کنار کر دیا۔ ہمارے ہاں کچھ عرصہ سے اس تقریب کو بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ لیکن، جیسا کہ ہر اس قوم کے ہاں ہوتا ہے جو عقل و فکر اور علم و بصیرت سے کام لینے کے بجائے اپنے معاملات کو جذبات کے طوفانوں کی نذر کر دے، یہ تقریب کسی بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ بننے کے بجائے، محض نمائشوں اور آرائشوں کا بے روح مظاہرہ بن کر رہ گئی ہے۔

موجودہ تقریبات

ان جلوسوں کو چھوڑیئے جن میں ہر قسم کی بازاریت کے مظاہرے ہوتے ہیں، آپ میلاد کی کسی مجلس میں جائیے، وہاں جھوم جھوم کر نعتیں پڑھی جائینگی، لیکن ان نعتوں میں ہو گا کیا؟ زلف و خط و خال کے حسین تذکرے، کاکلِ مشکیں اور گیسوئے عنبریں کی شیریں حکایتیں، سرو قامتی اور لالہ رخساری کی دل افروز داستانیں۔ ہجر و وصال کے جانسوز افسانے۔ اور اب تو انتہا یہ ہے کہ ان نعتوں کی دھنیں بھی فلمی گیتوں سے نقل کی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر آپ تھوڑے سے وقت کے لئے آنکھیں بند کر لیں، تو

تمیز ہی نہ ہو سکے کہ آپ میلاد کی مقدس مجلس میں بیٹھے ہیں یا کسی سینما ہال میں۔

اور اگر آپ میلاد کی مجلس سے اٹھ کر وعظ کی محفل کی طرف جائیں تو وہاں آپ کو یا تو اس قسم کی بحثیں سنائی دیں گی کہ حضورؐ نور تھے یا بشر، اور یا آپ کے معجزات کا محیر العقول بیان ہوگا۔ میں اس وقت معجزات کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ نبی اکرمؐ کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (۳۳/۲۱)

تمہارے لئے رسول کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

ظاہر ہے کہ جب معجزات کا ظہور ہم سے ممکن ہی نہیں تو حضورؐ کے معجزات ہمارے لئے اسوہ (ماڈل) کس طرح بن سکتے ہیں۔ ہمارے لئے تو آپؐ کی سیرتِ طیبہ کا وہی حصہ نمونہ بن سکے گا جسے ہم خود عمل میں لا سکیں۔

اور اگر آپ ان محفلوں کو چھوڑ کر کسی ماڈرن جلسہ گاہ میں جا پہنچیں تو وہاں بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائیگا کہ بعثتِ نبی اکرمؐ سے پہلے عربوں میں اس قدر خرابیاں تھیں ــــ شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی، جوئے کے وہ بے حد رسیا تھے۔ فحش کلامی ان کی محفلوں کی زینت تھی، بات بات پر مشتعل ہو کر جنگ و قتال پر اتر آنا ان کا انداز زیست بن چکا تھا ــــ آپؐ نے ان کی ان خرابیوں کو دور کیا اور انہیں ایک مہذب اور شائستہ قوم بنا دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاشرہ کی اس قسم کی خرابیوں کی اصلاح، قابلِ ذکر کارنامہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ خدا کا ایک ایسا جلیل المرتبت رسول، جو نبوت کے سلسلہ دراز کی آخری کڑی ہو اور جس کے پیغام نے تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک ضابطۂ زندگی بننا ہو، کیا اس کا کارنامہ اتنا ہی تھا کہ اس نے چند معاشرتی خرابیوں کی اصلاح کر دی اور اس قوم کو ایک وسیع سلطنت کا وارث بنا دیا؟ اس قسم کی حاصل کائنات، برگزیدۂ روزگار ہستی کے کارنامے یقیناً اس سے کہیں زیادہ عظیم اور کہیں بڑھ کر جلیل ہونگے جس ذاتِ گرامی کو خود خدا نے رحمۃ للعالمین قرار دیا تھا اس کے سحابِ کرم کی گہرباریوں کو حدود فراموش اور قیود نا آشنا ہونا چاہیئے اور وہ ایسی ہی تھیں۔

رسولؐ کی بعثت کا مقصد

ایک رسول کی بعثت کا مقصد کیا ہوتا ہے، اسے علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں، ایک مقام پر، نہایت مختصر لیکن بڑے جامع اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> رسول اس لئے آتا ہے کہ زمانے کے طوفانوں پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے (مضراب وحی سے) اس کے نفسِ قدسی میں ایسی ولولہ انگیز قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیائے انسانیت میں

ایک انقلاب برپا کر دیں۔ یہ آرزو، کہ جو کچھ اس نے (وحی کی روشنی میں) دیکھا ہے، وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

بالفاظِ دیگر، ایک رسول آتا اس لئے تھا کہ جو دنیا اس کے سامنے ہو اس کی جگہ ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ خارجی کائنات میں ایک نئی دنیا بسانے کے لئے، اسے دلوں کی دنیا کو بدلنا پڑتا ہے۔ انسانی فکر و نظر میں ایک انقلابِ عظیم برپا کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

وہ دنیا کے مروجہ اعتقادات، نظریات، تصورات، خیالات کو ایک ایک کر کے لیتا ہے اور ان کی بنیادوں تک کو اکھیڑ کر، ان کی جگہ جدید تصورات و نظریات کی دنیا بساتا ہے۔ وہ نگاہوں کے زاویے بدل دیتا ہے۔ وہ اقدار کے پیمانے بدل دیتا ہے، وہ خیر و شر کا معیار بدل دیتا ہے، وہ نصب العینِ حیات بدل دیتا ہے، وہ کاروانِ انسانیت کی منزلِ مراد بدل دیتا ہے، وہ زندگی کا مقصود بدل دیتا ہے۔ مقصود کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ غرضیکہ وہ قرآن کی زبان میں — یہ زمین بدل دیتا ہے۔ یہ آسمان بدل دیتا ہے اور ان کی جگہ ایک نئی زمین کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک نیا آسمان وجود میں لاتا ہے۔ اس کی نگاہ، انسانی فکر کی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دیتی ہے جس سے ہر بنائے کہنہ ویران ہو جاتی ہے اور اس تخریب کے بعد وہ فکر و نظر کے ان ویرانوں میں، دنیائے تصورات کی ایک نئی جنت آباد کرتا ہے۔ ایک رسول درحقیقت

پیغامِ برِ انقلاب

ہوتا ہے۔ ایک عظیم انقلاب کا پیغام بر — ایسے عظیم انقلاب کا پیغام بر جس کا تصور تک بھی فکرِ انسانی نہیں کر سکتی — نظریات و معتقدات کی دنیا میں انقلاب برپا کرنا، کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ چھوٹے سے پیمانے پر اس کا اندازہ آپ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے کسی دوست سے اس کی عزیز سے عزیز دنیاوی متاع مانگیں، وہ بخوشی دے دیگا۔ لیکن آپ اسکے کسی عقیدہ کو غلط کہہ دیں، آپ دیکھیے گا کہ اس سے دوستی کے کتنے کتنے مضبوط رشتے ٹوٹ جاتے اور رفاقتوں کے کیسے کیسے محکم عہد و پیمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں — رسول، یہ آسمانی انقلاب کا داعی، کسی ایک فرد کے عقیدے کو غلط نہیں ٹھہراتا۔ وہ سارے معاشرہ کے عقیدے کی

تغلیط کرتا ہے اور معاشرہ کے کسی ایک عقیدہ کی تردید و تکذیب نہیں کرتا، اس کے تمام معتقدات و نظریات کو باطل ٹھہراتا ہے۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "کفر بالطاغوت" ہے جو ایمان باللہ کی تمہید ہوتا ہے۔ یہی لا اِلٰہ اس داعیِ انقلاب کے پروگرام کی پہلی اور لاینفک کڑی ہوتی ہے۔ وہ جب تک دلوں کے کعبہ سے ہر کہنہ صنم کو نکال باہر نہیں کرتا، اس کے اندر قدم نہیں رکھتا۔ یہی وہ ہمت طلب اور شکیب آزما مرحلہ تھا جسے قرآن نے ایک حوصلہ شکن فریضہ قرار دیا تھا جب کہا تھا کہ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۔ (۹۴/۲-۳) "ہم نے تمہارے سر سے اس بوجھ کو اتار دیا جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی"۔

دُنیائے مذہب میں انقلاب

اس قسم کی انقلاب آفرینی، دنیائے تہذیب اور جہانِ تمدن میں بھی کچھ کم مشکل نہیں ہوتی، لیکن مذہب کے تراشیدہ بتوں کو توڑنا اور توڑنا بھی مذہب ہی کے تیشوں سے، انتہائی جانگسل اور (بظاہر) ناممکن العمل پروگرام ہوتا ہے۔ اگر کوئی دہریہ اور مادہ پرست، مذہبی تصورات کی تردید کرے تو اس کی یہ حرکت قابلِ فہم ہوگی۔ لیکن مذہب کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر مذہب کے خلاف دعوتِ انقلاب دینا، نہ صرف دشوار ترین فریضہ ہوگا بلکہ محیر العقول اقدام بھی۔ میں آج کی نشست میں عزیزانِ گرامی قدر! مختصر الفاظ میں یہ عرض کروں گا کہ حضور نبی اکرمؐ نے خود مذہب کے مسلّمات میں کس قدر عظیم انقلاب برپا کیا، اور یوں عالمگیر انسانیت کو انسانوں کے خود تراشیدہ معتقدات کی ان زنجیروں سے چھڑایا جن میں وہ صدیوں سے جکڑے چلی آرہی تھی، اور جن کے خلاف لب کشائی کرنا تو ایک طرف، دل میں گرانی تک محسوس کرنا بھی، کس طرح ان کی روح میں کپکپی پیدا اور دلوں میں لرزہ طاری کر دیتا تھا۔ اور یہی حضورؐ کا وہ معرکہ آرا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے عالمِ انسانیت، قیامت تک، اس محسنِ اعظمؐ کا زیرِ بارِ احسان رہے گا۔ وَمَا تَوْفِيْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِيْمِ ۔

خدا کا غلط تصوّر

مذہب کی دنیا میں بنیادی تصور خدا کا ہے (ایک آدھ کو چھوڑ کر) تمام مذاہبِ عالم میں مذہب پرست ہونے کے لئے خدا پر ایمان شرطِ اولین ہے۔ لیکن نبی اکرمؐ کے ظہورِ قدسی سے پہلے، تمام مذاہب میں خدا کا تصور ایک مطلق العنان، مستبد آمر (ڈکٹیٹر) کا سا تھا۔ جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ تھا نہ قانون۔ نہ کوئی دستور تھا نہ آئین۔ وہ جو جی میں آئے کرتا اور جس قسم کا بھی چاہے حکم صادر کر دیتا تھا۔ دنیا کے شہنشاہوں کی طرح، وہ اپنے تختِ حکومت پر بیٹھا، انتہائی دبدبہ اور جلال سے حکمرانی کرتا تھا۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ (سعدی کے الفاظ میں)، گہے بسلامے برنجد و گاہے بہ دشنامے خلعت بخشد۔۔۔ کبھی موج میں آگیا تو گالیاں دینے والوں کو جاگیریں عطا کر دیں۔ غصہ میں آگئے تو سلام کرنے والے کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ وہ جو کرتا

تھا اس کے لئے اسے نہ کسی کو وجہِ جواز بتانے کی ضرورت تھی نہ دلیل و حکمت بیان کرنے کی حاجت. موت اور زندگی، خوش حالی اور تنگ دستی، امیری اور غریبی، عزت اور ذلت، سب اس کے قبضہ قدرت میں تھی وہ جس سے خوش ہوتا ایک آن میں لاکھوں کا مالک بنا دیتا اور جس سے ناراض ہوتا اسے نانِ شبینہ تک کا محتاج کر دیتا۔ اس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ نہ کوئی اس سے پوچھ سکتا تھا کہ اس نے اسے کیوں تباہ کر دیا نہ اتنا دریافت کر سکتا تھا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں اس قدر سخت سزا دی گئی۔ یہ سب اس کی خوشی اور ناراضگی پر منحصر تھا اس لئے ہر ایک کی ہر وقت یہ خواہش اور کوشش رہتی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھے (دنیاوی

خدا کو خوش رکھو

بادشاہوں کی طرح) اسے خوش رکھنے کے لئے کبھی اس کی شان میں حمد و ستائش کے قصیدے پڑھے جاتے اور کبھی اس کے حضور رو رو کر، اور گڑ گڑا گڑ گڑا کر، رحم کی درخواستیں کی جاتیں۔ کبھی اس کی بارگاہ میں نذرانے پیش کئے جاتے اور کبھی اسے قربانیوں اور چڑھاووں سے خوش کیا جاتا۔ لیکن یہ کچھ کرنے کے باوجود، ہر شخص اس کے عتاب سے ڈرا ڈرا، سہما سہما رہتا، کہ نہ جانے وہ کس وقت غصہ میں آ کر کیا کر دے۔

خدا کے مقربین

دنیاوی بادشاہوں کی طرح، خدا کا ایک دربار بھی ہوتا تھا جس میں اس کے "مقربین" اس کے گرد و پیش مسند نشین ہوتے۔ باہر حاجب و دربان ہوتے، اس لئے اس تک کسی شخص کی براہِ راست رسائی نہ ہو سکتی۔ اس تک درخواست پہنچانے کے لئے وسیلوں اور سفارشوں کی ضرورت تھی اور یہ وسیلے اور سفارشی وہی تھے جو اپنے آپ کو اس کا مقرب کہتے تھے۔ عوام بیچاروں کے کام، ان کے وسیلوں اور سفارشوں کے بغیر نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے انہیں خدا کی ہی خوشامد نہیں کرنی پڑتی تھی — ان مقربین کے حضور بھی ہر وقت سجدہ ریز رہنا پڑتا تھا۔ ان مفلسوں اور غریبوں، مظلوموں اور بیکسوں، محتاجوں اور لاچاروں کے دل پر خدا کا خوف ہی مسلط نہیں رہتا تھا۔ یہ "مقربین بارگاہِ خداوندی" بھی ان کے اعصاب پر ہوا بن کر سوار رہتے تھے۔

مفاد پرست گروہوں کا تراشیدہ تصوّر

خدا کا یہ تصور در حقیقت مفاد پرست گروہوں کا پیدا کردہ تھا۔ اس گروہ میں سرِ فہرست خود بادشاہ تھا جو اپنے آپ کو خدا کا اوتار، یا ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ اور عکس) قرار دیتا تھا — خدا کا یہی تصور تھا جو اس زمانے کے مطلق العنان بادشاہوں اور مہاراجوں کو (SUIT) کرتا تھا۔ ان کی ہر دھاندلی کی سند یہ تھی کہ وہ عین خدائی احکام اور فیصلوں کے مطابق تھی۔ جس طرح خدا کے کسی حکم یا فیصلہ کے خلاف، لب پر حرفِ شکایت لانا تو ایک طرف، دل کی گہرائیوں میں بھی کبیدگی محسوس کرنا، خدا کے عتاب کا مستوجب بننے کے لئے

کافی تھا۔ اسی طرح حکمران کے کسی فیصلے سے سرتابی کا تصور بھی انتہائی گناہ سمجھا جاتا تھا جس طرح خدا سے کوئی چیز بطور استحقاق طلب نہیں کی جاتی تھی ـــ بطور خیرات مانگی جاتی تھی ـــ اسی طرح بادشاہ سے بھی اپنے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگا جا سکتا تھا۔ سب کچھ اس کے رحم و کرم پر موقوف تھا۔

مذہبی پیشوائیت

اس فہرست میں، بادشاہوں کے بعد مذہبی پیشواؤں کا نمبر آتا ہے۔ یہ خدا کے مقرب سمجھے جاتے تھے۔ خدا تو نہ کسی کے سامنے آتا تھا، نہ کسی سے براہ راست بات چیت کرتا تھا۔ اس لئے یہ "تقدس مآب گروہ" خدا کا نمائندہ بن کر زمین پر خدائی کرتا تھا۔ لوگوں کے دل میں، بادشاہ، بلکہ خدا کا اتنا ڈر نہیں تھا جتنا ان نمائندگانِ خدا کا خوف تھا۔ بادشاہ اور ان مذہبی پیشواؤں ـــ فرعون اور ہامان ـــ کا باہمی گٹھ جوڑ تھا ـــ یہ بادشاہ کو خدا کا اوتار قرار دے کر، لوگوں سے اس کے حضور سجدے کراتے، وہ انہیں "روحانی مملکت" کے ارباب بست و کشاد ٹھہرا کر، عوام سے ان کی پرستش کراتا۔

سرمایہ دار طبقہ

نوعِ انسان کے ان شکاریوں میں، تیسرا درجہ جاگیرداروں، زمینداروں، سرمایہ داروں کا تھا "جو رزق کے سرچشموں پر قابض ہو کر، مزدور اور محنت کش طبقہ سے اپنی من مانی کراتے۔ مذہبی پیشوائیت، ان مفلوک الحال، مفلس و محتاج محنت کشوں کو یہ کہہ کہہ کر سلاتے رکھتی کہ چونکہ رزق کی بست و کشاد خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اس لئے ان سرمایہ داروں کی بے حد و حساب دولت پر حسد کرنا یا اپنی مفلوک الحالی پر شکوہ سنج ہونا، خدائی فیصلے کے خلاف سرکشی کرنا ہے۔ اس لئے اس کا خیال تک بھی دل میں نہیں لانا چاہیئے۔ انسان کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہر حال میں راضی برضا رہے۔ دنیا کی عیش سامانیاں اگر امیروں کے حصہ میں آتی ہیں تو اس پر افسردہ ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اس کے بعد اُخروی زندگی کی ابدی مسرتیں سب غریبوں کے حصے میں آئیں گی۔

انسان کی حالت

یہ تھا بعثتِ محمدیہ کے وقت خدا کا تصور اور اس کے تابع انسان کی حالت۔ اقبالؒ کے الفاظ میں اس وقت کیفیت یہ تھی کہ:

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش
بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر، صد نخچیر گیر!

یہ تھی انسان کی زار و زبوں حالت جب حضور نبی اکرم تشریف لائے۔ آپ آئے اور دنیا کے تمام "خدا پرستوں" کو مخاطب کر کے یہ انقلاب آفریں اعلان فرمایا کہ خدا کا یہ تصور تمہاری اپنی مفاد پرستیوں اور چیرہ دستیوں کا تراشیدہ ہے۔ اسے حقیقی خدا سے کوئی تعلق نہیں۔

حقیقی خُدا

حقیقی خدا وہ ہے جس نے اس کارگہ کائنات کو پیدا کیا اور پھر ہر شے کے لئے ایک اندازہ، پیمانہ اور قانون مقرر کر دیا جس کے مطابق وہ زندگی بسر کرتی ہے۔ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا - (۲۵/۲)۔ لہٰذا یہاں کسی مستبد مطلق العنان حاکم کی آمریت کارفرما نہیں۔ یہاں ہر کام ..... قاعدے اور قانون، دستور اور آئین کے مطابق سرانجام پاتا ہے۔ جسے خدا کا امر (یعنی حکم) کہا جاتا ہے وہ درحقیقت قانون ہی کا دوسرا نام ہے۔ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا (۳۳/۳۸)۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں، اور ہر ایک پر یکساں طور پر نافذ۔ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا - (۳۳/۶۲)۔ یہ قوانین خارجی کائنات میں، قوانینِ فطرت کی اصطلاح سے متعارف ہیں اور انسانوں کے لئے اس قسم کے غیر متبدل قوانین، وحی کی رو سے دیئے گئے ہیں جو کتاب اللہ (قرآن کریم) کے اندر محفوظ ہیں۔ خدا کا انسانوں کے ساتھ تعلق انہی قوانین کے ذریعے سے ہے۔ براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ جب کوئی شخص کتاب اللہ کو پڑھتا ہے تو خدا اس سے ہمکلام ہوتا ہے، اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو وہ خدا کے منشاء کو پورا کرتا ہے۔

قانون کی کارفرمائی

ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے خود انسانوں ہی کا بھلا ہوتا ہے، خدا کا کچھ نہیں سنورتا۔ نہ ہی ان کی خلاف ورزی سے خدا کا کچھ بگڑتا ہے۔ اس لئے خدا کے خوش یا ناراض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ - وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا - (۱۷/۷)۔ "اگر تم اچھے کام کرو گے تو اس کا فائدہ تمہیں ہی پہنچے گا اور اگر غلط روش اختیار کرو گے تو اس کا نقصان بھی تم ہی اٹھاؤ گے۔" لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ - (۵۳/۳۸)۔ "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔"

یہ واضح ہے کہ جہاں قانون کی کارفرمائی ہو وہاں نہ کسی کی خوشامد درآمد کی ضرورت ہوتی ہے نہ رشوت اور نذر لینے کی۔ وہاں نہ کسی وسیلے کی احتیاج ہوتی ہے نہ کسی سفارشی کی تلاش۔ وہاں نہ کسی سے بے انصافی ہوتی ہے نہ کسی کی رُو رعایت۔ وہاں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ - (۲/۱۲۳)۔ "وہاں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کے بدلے میں اپنے آپ کو پیش کر سکے گا، نہ کسی کی سفارش کام آ سکے گی نہ ہی کوئی شخص کچھ فدیہ (یا رشوت) دے کر چھوٹ سکے گا نہ ہی کوئی کسی دوسرے کی کسی قسم کی مدد کر سکے گا۔" قانون کی یہی کارفرمائی تھی جس کے پیش نظر نبی اکرم نے اپنی حیاتِ دنیوی کی آخری ساعتوں میں اپنی چاہتی بیٹی حضرت فاطمہ سے

صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ

فاطمہؓ! خدا کے ہاں محمدؐ کی بیٹی ہونا تمہارے کسی کام نہیں آسکے گا۔ وہاں صرف تمہارے اپنے اعمال کام آسکیں گے۔

نہیں! اس سے بھی آگے بڑھیے۔ آپؐ نے خود اپنے متعلق فرمادیا کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ۔ میں خود خدا کے قوانین ہی کا اتباع کرتا ہوں جو اس نے بذریعہ وحی عطا فرمائے ہیں۔ اِنِّىْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّىْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (۱۵/۶) اگر میں بھی ان قوانین کی خلاف ورزی کروں تو اس کا خمیازہ مجھے بھی بھگتنا پڑے گا۔ اس سے مجھے بھی کوئی نہیں بچا سکے گا۔

غور فرمایا آپ نے عزیزانِ گرامی قدر! کہ حضور نبی اکرمؐ نے خدا کا کس قسم کا تصور پیش کیا اور یہ تصور عالمِ انسانیت میں کس قدر عظیم انقلاب کا اعلان تھا! آپؐ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے کھلے الفاظ میں فرمادیا کہ یاد رکھو۔

مصیبتوں کا ذمہ دار کون ہے؟

مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ۔ (۴۲/۳۰) جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ خدا کی طرف سے نہیں آتی، خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ یا تو تمہاری اپنی غلط تدبیر کا نتیجہ ہوتی ہے یا اس کا ذمہ دار معاشرہ کا غلط نظام ہوتا ہے۔ اگر وہ تمہاری اپنی غلط تدبیر کا نتیجہ ہے تو اس کی اصلاح خود کرو۔ اور اگر وہ غلط معاشرہ کا نتیجہ ہے تو اس معاشرہ کو الٹ کر اس کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کرو۔ جو لوگ تم سے کہتے ہیں کہ یہ مصائب اور تکالیف، یہ تباہیاں اور بربادیاں خدا کی طرف سے آتی ہیں، وہ تمہیں دھوکا دے کر تمہاری نگاہوں کا رُخ دوسری طرف پھیر دیتے ہیں تاکہ تم انہیں ذمہ دار ٹھہرا کر ان کا مؤاخذہ نہ کرنے لگ جاؤ۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۳/۱۱۷) خدا کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا بلکہ ان خود ہی اپنے آپ پر زیادتی کرتے ہیں۔ یاد رکھو! جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا کو منظور

اگر خدا کو منظور نہ ہوتا

نہ ہوتا تو ایسا کبھی نہ ہوتا، یہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں، یہ دھوکا دیتے ہیں۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ۔ یہ مشرکین کہیں گے کہ اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد نہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرتے، نہ ہی از خود حلال چیزوں کو حرام قرار دیتے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں، یہ سب خدا کی مشیت سے ہوتا ہے۔ انسان تو مجبورِ محض ہے، اس کی کیا مجال کہ خدا کے حکم کے بغیر کچھ کر سکے۔ اس کے جواب میں کہا۔ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے پہلے بھی خود فریب قومیں اسی طرح تقدیر کے عقیدہ کو اپنی غلط کوشیوں کے لئے آڑ بنا لیا کرتی تھیں۔ لیکن اس سے

خدا کا قانونِ مکافات تو نہیں بدل جاتا تھا۔ وہ لوگ اپنے غلط اقدامات کو مشیت خداوندی کی طرف منسوب کئے جاتے۔ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا۔ (۶/۱۴۹) اور ان کے اعمال کے نتائج تباہیاں بن کر انہیں گھیر لیتے۔

آپ نے غور فرمایا! برادرانِ گرامی قدر! کہ اس اعلان نے انسانی فکر و نظر کی دنیا میں کیا انقلاب عظیم برپا کر دیا؟ پھر آپ نے لوگوں سے کہا کہ یہ جو تم سے کہا جاتا ہے کہ رزق کی تنگی اور خوشحالی کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، وہ جسے چاہے کروڑ پتی بنا دے، جسے چاہے روٹی سے بھی محتاج کر دے، تو یہ بھی ان کا فریب ہے۔

رزق کی بست وکشاد

یاد رکھو! رزق کی بست وکشاد کے لئے بھی خدا کے قوانین مقرر ہیں۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ (۲۰/۱۲۴) جو ان قوانین سے اعراض برتتا ہے، تو اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ اگر کسی معاشرہ میں حالت یہ ہے کہ لاکھوں انسان رات کو بھوکے سوتے ہیں، اور ان کے بچے دودھ کے گھونٹ کے لئے ترستے ہیں، تو یہ کچھ خدا کی مرضی سے نہیں ہوتا، وہ معاشرہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے جس کا نتیجہ اس قسم کی ناہمواریاں ہوتی ہیں۔ تم ان کی فریب آمیز باتوں میں نہ آؤ۔ اس معاشرہ کو بدل کر ایسا معاشرہ قائم کرو جس میں رزق کی تقسیم خدا کے قوانین کے مطابق ہو۔ اور امیر اور غریب کی تفریق مٹ جائے۔ یاد رکھو! کوئی بچہ نہ امیر پیدا ہوتا ہے نہ غریب۔ یہ تمہارا غلط نظام ہے جو اس قسم کی تفریق پیدا کرتا ہے۔

اور یہ جو بگلا بھگت تمہیں یہ کہہ کر تھپکیاں دیتے رہتے ہیں کہ اگر تم مفلس اور غریب ہو تو اس سے دل گرفتہ نہ ہو۔ خدا کے مقرب بندوں کی یہی نشانیاں ہیں۔ تو یہ تمہیں سخت دھوکے میں رکھتے ہیں۔ یاد رکھو! "خوف اور بھوک خدا کا عذاب ہے۔" (۱۶/۱۱۲) اور یہ عذاب صرف اسی دنیا تک محدود نہیں جس کی یہ دنیا خراب ہے ــــ اور وہ اپنی اس خرابی کو خدا کی مشیت یا اس کے مقربین کی علامت سمجھ کر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہے، اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ میں نے جو آیت ابھی ابھی پیش کی ہے یعنی وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ــــ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی ــــ تو اس کا باقی حصہ یہ ہے کہ وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴) ہم اسے قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھائیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے خدا کے اس عظیم داعیٔ انقلاب نے ان جامع الفاظ میں بیان فرمایا کہ الفقر سواد الوجہ فی الدارین۔ مفلسی اور محتاجی، دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں روسیاہی کا باعث ہے۔ اور دوسری جگہ فرمایا کہ مفلسی اور محتاجی انسان کو کفر کی حد تک لے جاتی ہے۔

علماء ومشائخ

وہ مذہبی پیشوا جو مفاد پرست گروہوں کے ایجنٹ بن کر، عوام کو غلط عقاید کی افیون پلاتے رہتے ہیں، ان کے متعلق فرمایا کہ یاد رکھو! اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ

وَ الرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ یہ جو علماء و مشائخ بڑے مقدس بنے پھرتے ہیں، ان میں سے اکثریت کی یہ حالت ہے کہ یہ لوگوں کا مال حرام طور پر کھا جاتے ہیں اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں خدا کے صحیح نظام کو قائم نہ کرلیں اس لئے کہ صحیح نظامِ خداوندی میں انکا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ باقی رہے وہ سرمایہ دار جن کے یہ ایجنٹ ہوتے ہیں تو سن رکھو کہ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ (۹/۳۴) جو لوگ دولت کے ڈھیر جمع کرتے ہیں اور اسے ضرورتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے عام نہیں کرتے' ان سے کہہ دو کہ ان کی اس روش کا نتیجہ ایسی تباہی ہوگی جس سے وہ چیخ اٹھیں گے۔

غور فرمایا آپ نے عزیزانِ من! ایک خدا کے تصور میں صحیح تبدیلی پیدا کر دینے سے حضورؐ نے کس طرح مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی انسانیت سوز لعنتوں کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیا۔ باقی رہا نظامِ حکومت تو

حکومت

اس کے لئے آپ نے اعلان فرمایا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹)

کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین، حکومت حتےٰ کہ نبوت تک بھی دے دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم قانونِ خداوندی کی نہیں بلکہ میری محکومی اختیار کرو۔ اسے صرف یہ کہنا چاہیئے کہ اس ضابطۂ قوانین کی رو سے ربانی بن جاؤ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کی تعلیم کو تم اپنے دل پر نقش کرتے ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک اعلان سے حضورؐ نے کس طرح حکومت کے تصور کو بنیادی طور پر بدل دیا ۔ اعلان یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر اپنا حکم چلائے خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ حکومت صرف قانون کی ہوگی اور قانون بھی وہ جو خدا کا عطا کردہ ہو، کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کا وضع کردہ نہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ خود قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کے واحد حکمران تھے۔ لیکن حکمران کی کسی امتیازی شان کے پیدا نہ ہونے دینے کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ کسی نے آپ سے خطاب کرتے ہوئے کہا یا سیدنا! اے ہمارے آقا ۔ تو اس پر آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ دیکھو! تمہیں شیطان بہکا رہا ہے۔ آقا صرف خدا کی ذات ہے۔ میں تو عبداللہ کا بیٹا محمدؐ خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ آقائیت صرف ذاتِ خداوندی کے لئے ہے اور کسی کے لئے نہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

آپؐ نے مملکت کے ارباب بست وکشاد کے لئے حکام کے بجائے عمّال کی اصطلاح رائج فرمائی جس کے معنی حکم چلانے والے نہیں بلکہ کام کرنے والے کارندے کے ہیں۔ ان عمّال کو تملق پیشہ مصاحبوں کے نرغے سے بچانے کے لئے آپؐ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر کسی شخص نے حاکم کو خوش کرنے کے لئے ایسی بات کہہ دی جس سے اسکا خدا ناراض ہو جائے (یعنی وہ قانونِ خداوندی کے خلاف ہو) تو وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔

جس معاشرہ میں "ذاتی جائیداد" بنانے کا تصور نہ ہو اس میں رشوت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں تو نظامِ سرمایہ داری کی لعنتیں ہیں۔ لیکن آپؐ نے اس باب میں بھی اتنی دوربینی اور ژرف نگہی سے کام لیا کہ اس فتنہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ پہلے تو یہ فرمایا کہ "رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔" اس کے بعد آپ ایک قدم اور آگے بڑھے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے آپ یہ دیکھئے کہ آجکل تو رشوت "بالکل خرید وفروخت کے حساب سے کھلے بندوں لی اور دی جاتی ہے" لیکن جب اس کا چلن عام نہیں تھا تو لوگ حکام کے ہاں تحائف پہنچاتے تھے جسے ڈالی کہا جاتا تھا۔ جس حاکم نے ڈالی رکھ لی سمجھ لیا کہ اس کا پانی مرتا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ تحائف سے رشوت تک پہنچ گئے۔ حضور نبی اکرمؐ کی نگہ بصیرت اس فتنہ کے سرچشمہ کو بھانپ رہی تھی۔ ایک مرتبہ ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ حکومت کے واجبات ہیں جو میں نے لوگوں سے وصول کئے ہیں۔ اور یہ ایک تحفہ ہے جو انہوں نے مجھے ذاتی طور پر دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب تم عامل نہیں تھے اور اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تھے تو کیا یہ لوگ اس وقت بھی تمہیں تحائف بھیجتے تھے۔ انہوں نے نفی میں جواب دیا تو آپؐ نے فرمایا کہ پھر یہ تحفہ نہیں رشوت ہے۔ اسے بیت المال میں داخل کرو اور آئندہ کبھی تحائف قبول نہ کرو۔ آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ حضورؐ نے دوستداری کے ذاتی تعلقات اور سرکاری ملازموں کے ساتھ تعلقات میں کیسا لطیف لیکن نہایت عمیق خطِ امتیاز کھینچا ہے۔ دوستوں سے تبادلہ تحائف کی آپؐ نے ترغیب دلائی تھی کہ اس سے باہمی تعلقات میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے لیکن جب کسی سرکاری ملازم کو تحفہ دیا جاتا ہے تو وہ دوستداری کے تعلقات کی بنا پر نہیں ہوتا۔ وہ اس سے تعلقات پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے تاکہ اس سے آگے چل کر کچھ مفاد حاصل کئے جائیں۔ یہی ہیں وہ تحائف جو رشوت کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ اس لئے آپؐ نے ان سے بھی روک دیا۔

اب ہمارے سامنے عزیزانِ من! اس مرحلہ کا نازک ترین گوشہ آتا ہے۔ آپ دنیا کے مذاہب پر ایک نظر ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے اپنے مذہب کے بانی کو انسانی سطح سے اٹھا کر فوق البشر حیثیت دیدی۔

کہیں اسے خدا کا اوتار بنا یا گیا، کہیں خدا کا بیٹا، کہیں خود خدا۔ لیکن حضورؐ نے اپنے متعلق اعلان فرما دیا — اور

رسول کی حیثیت

ایک بار نہیں، بار بار یہ اعلان کیا کہ — اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ — سن رکھو کہ میری حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ میں خود تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اور جب میں اس وحی کو تم تک پہنچا دیتا ہوں تو پھر مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ مجھے کوئی فوق الفطرت قوت حاصل نہیں — لَا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا۔ (۱۰/۴۹)۔ دوسرے تو ایک طرف، مجھے خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں۔ میں غیب کی باتوں کو کبھی نہیں جانتا — لَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۶/۵۰)۔ تم مجھ سے معجزات طلب کرتے ہو کہ وہ اس بات کی شہادت بنیں کہ میں اپنے دعوائے رسالت میں سچا ہوں یا جھوٹا۔ سنو کہ میرا معجزہ کیا ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (۱۰/۱۶)

میں نے اس سے پہلے اپنی ساری عمر تمہارے درمیان گزاری ہے۔ تم ذرا عقل و فکر سے کام لے کر سوچو کہ اس قسم کی زندگی کسی جھوٹے اور فریب کار کی ہوتی ہے یا سچے اور راستباز انسان کی؟

یہ ہے میرے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت اور میرا معجزہ — وہ معجزہ جو تم میں سے بھی ہر ایک دکھا سکتا ہے۔

مذہب کی دنیا میں کسی رسول کا یہ اعلان ہی کچھ کم انقلاب انگیز نہ تھا کہ وہ اور انسانوں جیسا ایک انسان ہے اور (وحی کے علاوہ) اس نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے وہ ایک انسان کی حیثیت سے کیا ہے۔ اس لئے اسے ہر وہ انسان کر کے دکھا سکتا ہے جو وحیٔ خداوندی کا اتباع کرے۔ لیکن آپؐ ایک قدم اور آگے بڑھے اور ایک اعلان ایسا فرمایا جو اس سے پہلے نہ کہیں دیکھا تھا نہ سنا۔ اور جو مذہب کی دنیا میں بڑا ہی محیر العقول اور

ختمِ نبوّت

خارقِ عادت تھا۔ اور وہ اعلان یہ تھا کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اب کوئی آ کر یہ بات بھی نہیں کہہ سکے گا کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اس لئے تم میری وحی کا اتباع کرو۔ خدا کی طرف سے جو کچھ ملنا تھا وہ مل چکا اور اس کی کتاب میں محفوظ کر دیا گیا۔ اب دنیا کے کسی انسان کے لئے اتنی سی فوق الفطرت خصوصیت کی گنجائش بھی نہ رہی کہ اسے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے — نہ ہی کسی انسان کے لئے اس کا حق باقی رہا کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنی بات خدا کی وحی کہہ کر منوائے۔ اس سے انسان کو کسقدر فکری اور تسلیبی آزادی نصیب ہوتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے — یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؔ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا

کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان، جو ایشیائے قبل از اسلام کی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے اور (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل وغایت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔ (خطباتِ اقبال)

خدا کی طرف سے مکمل راہ نمائی اس کی کتاب کے اندر محفوظ شکل میں موجود ہے۔ اب مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ اس راہ نمائی کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کا حل باہمی مشاورت سے غور و فکر اور علم و بصیرت کی رو سے تلاش کریں۔ اب لوگوں کو کسی خاص شخصیت کی طرف آنکھیں لگا کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں کہ جو فیصلہ وہاں سے ملے اس پر عمل کیا جائے۔ اب شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا، اور اسے ختم یہ کہہ کر کیا گیا کہ کائنات کی عظیم ترین شخصیت خود محمد رسول اللہ کی ہے لیکن سن رکھو کہ۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ...... (۳/۱۴۳)

محمد بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کے ایک پیغامبر ہیں۔ ان سے پہلے بھی خدا کے پیغامبر اپنی اپنی باری آئے اور دنیا سے چلے گئے۔ سو کیا جب یہ کل کو مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم (یہ کہہ کر) الٹے پاؤں لوٹ جاؤ گے (کہ بات تو ساری محمدؐ کی ذات سے تھی۔ جب وہ نہیں رہے تو معاملہ ختم ہو گیا)

نہیں! اب بات شخصیتوں پر منحصر نہیں رہی۔ اب دور اصولوں کی حکمرانی کا آگیا ہے۔ وحی کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے کام لینا، یہ ہے ختم نبوت کا عملی مفہوم۔ اور یہاں سے ہمارے سامنے ایک اور عظیم انقلاب کا اشارہ سامنے آتا ہے۔

عقل کا مقام

"مذہب میں عقل کا دخل نہیں"۔ اسے دنیا کے ہر مذہب میں بطور مسلمہ تسلیم کیا جاتا تھا (اور کیا جاتا ہے)۔ حضور نبی اکرمؐ نے بتایا کہ انسانی زندگی میں عقل کو بڑا بلند مقام حاصل ہے۔ جو کچھ میں عرض کرنے لگا ہوں اسے برادرانِ عزیز! غور سے سنیئے گا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اور

عرض کیا کہ اے ام المومنین! ایک شخص رات کو زیادہ سوتا ہے اور کم عبادت کرتا ہے اور دوسرا زیادہ عبادت کرتا ہے اور کم سوتا ہے۔ آپ کے نزدیک دونوں میں سے کونسا زیادہ پسندیدہ ہے۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں نے ایسا ہی سوال رسول اللہؐ سے کیا تھا تو آپؐ نے جواب دیا تھا کہ ان میں سے جو زیادہ عقلمند ہے وہ۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ! میں نے تو ان کی عبادت کے متعلق پوچھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ اے عائشہؓ! ان کی عقلوں کے متعلق سوال ہوگا پھر جو شخص زیادہ عقلمند ہوگا وہی دنیا اور آخرت میں افضل ہوگا۔ (کتاب الاذکیا۔ ابن جوزی)

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں عزیزانِ من! کیا مذہب کے سارے لٹریچر میں آپ کو کہیں اور بھی اس قسم کا انقلاب انگیز اعلان ملتا ہے؟ یا اس قسم کا اعلان کہ

مسلمانوں میں کامل ایمان اسکا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔ (ترمذی)

عبادت اور اخلاق

حضورؐ کے زمانے میں دو صحابی بیبیاں تھیں۔ ایک رات بھر نمازیں پڑھتیں، دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ خیرات بھی بہت کرتیں مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا ناک میں دم کئے رکھتیں۔ دوسری بی بی صرف فرض نماز پڑھتیں اور تھوڑا بہت خیرات کا کام کرتیں مگر کسی کو اذیت نہ پہنچاتیں۔ آپؐ سے ان دونوں کے متعلق پوچھا گیا تو آپؐ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ اس میں کوئی نیکی نہیں۔ وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی۔ اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ وہ جنتی ہوگی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی بات بتاؤں جو روزہ، نماز اور زکوٰۃ سے بھی درجہ میں افضل ہے۔ صحابہؓ نے بڑے اشتیاق سے دریافت فرمایا تو آپؐ نے کہا کہ

باہمی تعلقات کا درست رکھنا۔[1]

حتیٰ کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ

اپنے کسی بھائی کو دیکھ کر خوشی سے مسکرانا بھی نیکی ہے۔[2]

مذہب کی دنیا میں وہ لوگ بڑے خدا رسیدہ اور مقرب بارگاہِ خداوندی سمجھے جاتے ہیں جو اپنی عبادت میں شدت اختیار کریں۔ لیکن خدا کے اس داعیِ انقلابؐ نے اس باب میں بھی ایسے فیصلے دیئے جو مذہب کے اس مسلمہ کے خلاف چیلنج تھے۔ ایک صحابی حضرت عقبہ کی بہن نے منت مانی کہ وہ پیدل حج کرے گی۔

[1] ادب المفرد۔ امام بخاری۔ [2] ابوداؤد۔

حضرت عقبہؓ نے آکر حضورؐ سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اپنی بہن سے کہو کہ اللہ کو اس کی اس نذر کی حاجت نہیں۔ معمول کے مطابق سواری پر حج کرنے جائے۔ ایک دفعہ آپؐ نے دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے۔ آپؐ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ فلاں شخص ہے اور اس نے منت مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا، بیٹھے گا نہیں۔ اور نہ سایہ میں آرام کرے گا، اور نہ بات کرے گا اور مسلسل روزے سے رکھتا رہیگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس سے کہو کہ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہے ہو۔ باتیں کرو، سایہ میں بیٹھو اور معمول کے مطابق روزہ پورا کرو۔[1]

اور روزوں کے متعلق حضرت انسؓ کی وہ روایت بڑی اہم ہے جس میں انہوں نے بتایا کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ بعضوں نے ہم میں سے روزہ رکھا اور بعض نے نہیں رکھا۔ ہم نے ایک جگہ قیام کیا۔ جن لوگوں نے روزہ رکھا تھا وہ نڈھال ہو کر آرام کرنے لگے اور جن کا روزہ نہیں تھا وہ اپنے کاموں میں مصروف رہے۔ چنانچہ انہوں نے خیمے کھڑے کئے اور اونٹوں کو پانی پلایا۔ رسول اللہ نے دیکھ کر فرمایا کہ آج وہ لوگ جنہوں نے روزہ نہیں رکھا تھا، سارا ثواب لوٹ کر لے گئے ہیں۔[2]

یہ اور اس قسم کے اور ارشادات، جن میں معاملات کو عبادات پر ترجیح دی گئی ہے، درحقیقت قرآن کریم کے اس اعلانِ عظیم کی تفسیر و تشریح ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ۔ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ..... (۲/۱۷۷)

نیکی اور کشادگی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی اور کشادگی کی راہ اس کی ہے جو خدا، آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لانے کے بعد مال کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔ یعنی اپنے ضرورتمند اقربا کو، معاشرہ میں تنہا رہ جانے والوں کو۔ ان کو جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ ناوارد مسافروں کو، حاجتمندوں کو اور انہیں جو دوسروں کی محکومی میں ہوں۔...

آپ نے غور فرمایا کہ مذہبی رسمیات (FORMALISM) کے مقابلہ میں، معاشی معاملات کے حل کرنے کی

---

[1] ابوداؤد۔ [2] مشکوٰۃ

معاشیات اہمیت کو کس بلیغ انداز میں سامنے لایا گیا ہے؟ یہ وہ انقلابی آواز تھی جس کی اہمیت آج چودہ سو سال بعد ہمارے زمانے میں ابھر کر سامنے آگئی ہے۔ اس سلسلہ میں حضورؐ نے چند الفاظ میں جس بنیادی اصول کو بیان فرمایا، جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان وجد میں آجاتا ہے۔ فرمایا کہ

جس بستی میں کسی ایک فرد نے بھی اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام احمد)

یعنی اس بستی میں کتنے ہی نمازی، کتنے ہی پرہیزگار، کتنے ہی عبادت گزار کیوں نہ ہوں، اگر اس میں ایک فرد بھی بھوکا سو گیا ہے تو اس بستی کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ عزیزانِ من! سوچئے کہ معاشیات کی دنیا میں اس سے بڑھ کر انقلاب آفریں اصول کوئی اور بھی ہو سکتا ہے!

آپ نے یہ اصول بیان فرمایا اور پھر ایک عملی پروگرام کے مطابق اسے حقیقت میں تبدیل کر کے دکھا دیا۔ حضورؐ کی مکی زندگی اس پروگرام کے ابتدائی مراحل پر مشتمل تھی۔ اس میں آپؐ نے کیا طریق اختیار کیا، اسے سمجھنے کے لئے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی اس روایت کو سامنے لائیے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ

اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا ان کے بال بچوں پر ویسے ہی فاقے کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لیتے اور پھر اس کے برابر حصے کر کے آپس میں بانٹ لیتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔ (صحیحین)

یوں آپؐ نے اس معاشی پروگرام کی ابتدا فرمائی۔ اور رفتہ رفتہ ایک جماعت کی تشکیل کی جس میں، اپنی ضرورت سے زائد کسی کے پاس کچھ نہیں رہتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت ہے کہ

ہم رسول اللہؐ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس سواری ضرورت سے زیادہ ہو وہ اسے اس آدمی کو دے دے جسے اسکی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اسے دیدے جسکے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا تھا کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔ (مسلم)

اور یہ عملی تفسیر تھی اس ارشادِ خداوندی کی جس میں کہا گیا ہے کہ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کسقدر مال و دولت دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے عام کر دیں۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہو، سب کا سب۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ

نے فرمایا کہ

بندہ، میرا مال میرا مال کہتا ہے، حالانکہ مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں (۱) جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے۔ (۲) جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے۔ (۳) اور جو کچھ وہ دوسروں کی پرورش کے لئے دے کر اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر لیتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ یا تو چلا جاتا ہے یا وہ دوسروں کے لئے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔ (مسلم)

اور اس اصول پر آپ نے خود اس طرح عمل کر کے دکھایا کہ ضرورت سے زاید کبھی ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ نہ ہی کوئی جائیدادیں کھڑی کیں، نہ ہی کوئی ترکہ چھوڑا۔

زمینداری کا نظام

اُس زمانے میں ابھی کارخانہ داری کا نظام وجود میں نہیں آیا تھا۔ آمدنی کا سرچشمہ زمین تھی۔ اور زمین کے متعلق آپ نے یہ انقلاب آفریں اعلان فرمایا کہ

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین، اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ (ابوداؤد)

غور کیجئے، برادرانِ عزیز! کہ اس ایک اعلان نے کس طرح جاگیرداری اور زمینداری کے نظامِ باطل کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اس اصول کی عملی تفسیر کے لئے آپ نے فرمایا کہ "جب زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو خود کاشت سے زاید زمین کو بٹائی یا پٹہ پر دینا قطعاً ناجائز ہے۔" (مسلم)

آج عزیزانِ من! اس سوال نے بڑی اہمیت حاصل کر رکھی ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے یا سرمایہ کا۔ خدا کے اس دائمی انقلاب نے، آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس سوال کا جواب یہ کہہ کر دے دیا کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹)۔ معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ سرمایہ کے معاوضہ کو ربوٰ کہا جاتا ہے۔ اور ربوٰ حرام ہے۔ جو لوگ اس قسم کا معاشی نظام قائم کرنا چاہیں، انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہوگا (۲/۲۷۹) جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ آواز آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے بلند ہوئی۔ اس وقت دنیا نے اس پر دھیان نہ دیا اور جاگیرداری اور سرمایہ پرستی کے انسانیت کش نظام کو مسلکِ زندگی بنائے رکھا۔ لیکن اب زمانے کے تقاضے انسان کو مار مار کر اس طرف لا رہے ہیں۔ مگر (جیسا کہ تاریخ انسانیت میں شروع سے ہوتا چلا آ رہا ہے) خدا کے باطل تصور کا حامل مذہب پرست طبقہ اس کے راستے میں روک بن کر کھڑا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جو قومیں اس نظام کو اختیار کرنا چاہتی ہیں، وہ اس کے سوا چارہ نہیں دیکھتیں کہ وہ مذہب پرست طبقہ کے پیش کردہ خدا کو جھٹک کر الگ کر دیں۔ لیکن خدا کے نام پر اس انقلاب کی دعوت کا سہرا، عالمگیر انسانیت کے اس محسنِ اعظم کے سر ہے جس نے "الکاسب حبیب اللہ" کا نعرہ بلند

کرکے، محنت کو عبادت کا مقام عطا کر دیا۔

پھر حضورؐ نے ان لوگوں کو جو غریبوں کو ضروریاتِ زندگی سے محروم رکھتے ہیں، وارننگ دیدی کہ یاد رکھو! اگر تم نے ایسا نظام قائم کیا جس میں امیر امیر تر۔ اور غریب، غریب تر ہوتا جائے، تو اس کا انجام بڑا خطرناک ہوگا۔ سنیئے، کہ اس حقیقتِ کبریٰ کو آپ نے (آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے) کیسی بلیغ مثال میں پیش کیا۔ فرمایا کہ

> کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا، ہم نیچے کشتی میں سوراخ کرکے پانی لے لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے نہ روکا گیا تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ مگر انہیں پانی دے کر اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی)

سوچئے، عزیزانِ من! کہ اس سے بڑا انقلاب انگیز اعلان کوئی اور بھی ہو سکتا ہے!

(۰)

یہ ہیں برادرانِ گرامی قدر! اس عالمگیر انقلاب کے چند گوشے، جسے جہانِ فکر و عمل میں حضور نبی اکرمؐ نے برپا کیا۔ اس انقلاب کے بیشمار گوشے اور بھی ہیں لیکن اتنا وقت نہیں کہ میں انہیں بھی آپ کے سامنے پیش کر سکوں، اس لئے میں سردست اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ لیکن، اس سلسلہ کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور اعلان آپ کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھا ہے اور حضورؐ کا یہ وہ اعلانِ عظیم ہے جو تمام اسلامی تعلیم کا ماحصل ہے اور جس کی نظیر کم از کم میری نظروں سے کہیں نہیں گزری۔ آپ نے پوری انسانیت کو مخاطب کرکے فرمایا کہ یاد رکھو!

مَنِ اسْتَوٰى يَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ

جس شخص یا جس قوم کے دو دن ایک جیسے گزر گئے۔ یعنی جس کا آج اس کے گزشتہ کل کی نسبت ایک قدم آگے نہ بڑھا، وہ سخت نقصان میں رہا۔

غور فرمایئے برادرانِ عزیز! کیا اتنے کم لفظوں میں اس قسم کا انقلاب آفریں اعلان آپ کی نظروں سے کہیں اور بھی گزرا ہے؟ اور جو حقیقت اس میں بیان کی گئی ہے ایسی عظیم اور عمیق حقیقت کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟

بہر حال، حضورؐ کی تعلیم اور سیرت کے جو چند گوشے میں نے آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں، آپ ان پہ غور کیجئے اور سوچئے کہ اگر ہم سیرت کی تقریبات پہ انقلاب محمدیہ کے ان گوشوں کو دنیا کے سامنے لائیں

تو ہماری یہ محفلیں کس طرح ایک جہانِ نو کی تشکیل کا سامان فراہم کر دیں، اور دنیا کس طرح نوعِ انسان کے اس محسنِ اعظمؐ کی بارگاہِ عظمت مآب میں بصد عقیدت و احترام ہدیہ تبریک و تحسین پیش کرنے کے لئے بہمہ ذوق و شوق آگے بڑھے۔ یعنی دنیائے انسانیت کے اس محسنِ اعظمؐ کے حضور جس نے مردہ بستیوں میں صورِ اسرافیل پھونکا اور اس طرح (اقبالؒ کے الفاظ میں)

شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد
کوہکن را پایۂ پرویز داد
قوتِ او ہر کہن پیکر شکست
نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید
بندہ را باز از خداوندان خرید

ہزار ہزار سلام و رحمت ہو آسمانی انقلاب کے اس داعیٔ مبینؐ پر جس نے زندگی کو ایک نیا خواب، اور اس خواب کو ایک نئی تعبیر عطا کر کے کائنات کو اس قدر حسین اور زندگی کو ایسا پیارا بنا دیا۔

والسلام!

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

ہر اتوار کو ——— صبح آٹھ بجے

۲۵/بی گلبرگ لاہور میں ہوتا ہے

خواتین کے لئے پردہ کا خاص انتظام ہوگا۔ ——— نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور

حقائق و عبر

۱۔ نماز کے بدلے میں لڈو

موقر جریدہ المنبر (لائل پور) کی ۱۴ مئی کی اشاعت میں "عنوان بالا کے تحت حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے ہم نے نام اور مقام عمداً حذف کر دیئے ہیں۔

(فلاں قصبہ میں) ایک عجیب و غریب سودا ہوا۔ یعنی (فلاں صاحب) نے جو ساری نمازیں اپنی زندگی میں ادا کی تھیں، وہ (فلاں صاحب) کے ہاں چھ سیر لڈوؤں کے عوض سرِبازار فروخت کر کے رسید لکھ دی تاکہ سند رہے۔

اس خبر کو پڑھ کر جائزہ لیجئے کہ اسلام کے رکن کی توہین کی جرأت کس طرح ایک مسلمان کرتا ہے اور کس زاویئے سے اس رکن کو رسوا کرنے کی حوصلہ مندی سے کام لے کر اہل ایمان کی زندگی خراب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

خبر حیرت انگیز ہو یا تاسف خیز، ہمیں اس سے غرض نہیں۔ لیکن ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں المنبر اور اس کے ہم عقیدہ حضرات سے کہ انہیں اس سودے پر اس قسم کا تبصرہ کرنا کب مناسب ہے جب کہ وہ خود "ایصال ثواب" کے قائل ہیں۔ کیا ایصال ثواب سے یہی مراد نہیں کہ ایک شخص اپنے کسی حسن عمل کا ثواب دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے؟ یہ جو آئے دن مُردوں کے "قل" پر قرآن شریف ختم کر کے، اس کا ثواب مرنے کی طرف منتقل کیا جاتا ہے، یہ کیا ہے؟ اور سب سے بڑی مثال یہ کہ "حج بدل" سے مراد اس قسم کا سودا نہیں تو اور کیا ہے؟ "حج بدل" میں آپ اپنے خرچ پر ایک شخص سے حج کراتے ہیں اور وہ اپنے حج کا ثواب آپ کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اگر حج کا ثواب اس طرح دوسرے کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے تو نمازوں کا ثواب کیوں نہیں منتقل کیا جا سکتا؟ اور اگر نمازوں کے ثواب کے اس طرح انتقال سے اس رکن کی رسوائی ہوتی ہے تو ختم قرآن شریف سے (معاذ اللہ) قرآن پاک کی، اور حج بدل سے حج کے رکن کی رسوائی نہیں ہوتی؟

اور اگر اس خبر میں مضحکہ انگیز حصہ "لڈوؤں" سے متعلق ہے، تو وہ کون سا ایصالِ ثواب ہے جس کے بدلے میں مولوی صاحبان "لڈو" (معاوضہ) نہیں لیتے؟

یہ بالکل درست ہے کہ اس قسم کے سب سودے مضحکہ انگیز اور رسوا کن ہیں، لیکن ان کا سرچشمہ تو ایصالِ ثواب کا عقیدہ ہے۔ اگر آپ اس عقیدہ کی جگہ قرآن کریم کی اس تعلیم کو اپنا عقیدہ قرار دے لیں کہ ۔۔۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۔ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷/۷) اگر تم کوئی نیکی کرو گے تو اس کا فائدہ تمہاری اپنی ذات کو پہنچے گا۔ اور اگر برائی کرو گے تو اس کا خمیازہ بھی تمہیں ہی بھگتنا پڑے گا ۔۔۔ تو پھر اس قسم کے مضحکہ انگیز واقعات ظہور ہی میں نہ آئیں۔

قرآن کریم کا یہ ارشاد تو بالکل صاف اور سیدھا ہے۔ لیکن "لڈوؤں" کے سوال نے اسے پیچیدہ بنا رکھا ہے۔

(۰)

۲۔ فلم "خانۂ خدا"

ہم عصر ایشیا کی ۲۰ مئی کی اشاعت میں تحریر ہے کہ ایک صاحب نے مودودی صاحب سے حسب ذیل سوال کیا

آجکل مختلف شہروں میں ایک فلم "خانۂ خدا" چل رہی ہے اور لوگ اسے بڑی عقیدت سے دیکھنے جا رہے ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

آپ نے جواب میں

(طنزاً فرمایا) جی ہاں! طوائفیں میلاد کراتی ہیں تو وہاں بھی بعض لوگ عقیدت سے چلے جاتے ہیں۔

ہمیں نہ فلم "خانۂ خدا" سے کوئی تعلق ہے، نہ اس کے شرعاً جائز اور ناجائز ہونے کا سوال ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے پیشِ نظر صرف مودودی صاحب کا یہ جواب ہے۔

چند سال ادھر کا یہ واقعہ کسے یاد نہیں کہ مودودی صاحب نے لاہور کے نوربافوں سے ایک کپڑا بنوایا اور اس کا نام رکھ دیا ۔۔۔ غلافِ کعبہ ۔۔۔ پھر اس کپڑے کے جگہ جگہ جلوس نکالے گئے۔ اسپیشل گاڑیوں میں اسے ملک بھر میں پھرایا گیا۔ لوگوں کو اس کی زیارت کرائی گئی۔ ہزاروں روپے کے نذرانے وصول کئے گئے ۔۔۔ حالانکہ اس کپڑے نے کعبہ کی دیواروں کو چھوا بھی نہیں تھا۔ (اور بعد میں معلوم ہوا کہ اسے کعبہ پر چڑھایا بھی نہیں گیا تھا۔)

یہ سب کچھ نہ صرف شرعاً بجا اور درست، بلکہ بہت بڑے ثواب کا کام! اور کعبہ کی فلم کی نمائش "طوائفوں کا میلاد"! ہمیں معلوم نہیں کہ اس فلم کی نمائش کن لوگوں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ لیکن اتنا ضرور واضح ہے کہ یہ لوگ، جماعتِ اسلامی یا اس کے متفقین میں سے نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ دیکھتے کہ مودودی صاحب خود اس مقدس فلم کا افتتاح فرماتے۔

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ یہ فلم سعودی عرب کے بادشاہ کی اجازت سے بنی ہے اور وہ خود اس میں نمایاں طور پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ کیا مودودی صاحب شاہِ حجاز کے اس اقدام کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرمائینگے۔ یا یہاں "حکمتِ عملی" دہن دوز ہو جائے گی۔

(۰)

مولوی صاحب کا درسِ قرآن

کراچی کے "حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی" کا ایک درسِ قرآن، اخبار سیرت (لاہور) کی ۳۰ مئی کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ آپ بھی لطف اندوز ہوں۔ ارشاد ہے۔

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تخلیق کے بعد حضرت آدم نے اپنے گرد و پیش کو دیکھا تو انہیں ہر قسم کی مخلوق نظر آئی۔ طرح طرح کے حیوانات، چرند سے و پرند سے نظر آئے۔ لیکن ایسی کوئی مخلوق جو اپنی ہم جنس ہو اور جس سے انس و سکون حاصل ہو، نظر نہ آئی۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بڑی وحشت سی ہوئی اور دل ہی دل میں یہ تمنا اور آرزو پیدا ہوئی کہ مجھے کوئی ایسی مخلوق نصیب ہو جائے جس کی رفاقت اور معیت سے مجھے چین اور سکون ملے۔ چنانچہ دوسرے جمعہ کو جب کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام عالمِ خواب میں تھے اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے بائیں پہلو کو چیر کر ایک حسین و جمیل اور خوبصورت عورت پیدا کرو جو آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے موجبِ تسکین ہو۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت حوا کو آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا۔ بہرحال آدم کے بائیں پہلو کو چیر کر پیدا کیا گیا ہو یا بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں حضرت آدم کو کوئی تکلیف اور کوئی درد محسوس نہیں ہوا، اور بغیر تکلیف کے اللہ نے حضرت حوا کو پیدا فرما دیا۔ حضرت آدم جب نیند سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ انھیں کی جنس سے ایک مخلوق عورت کی شکل میں ان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے۔

حضرت آدم نے پوچھا کہ تو کون ہے؟ غیب سے آواز آئی کہ یہ ہماری کنیز اور بندی ہے۔ اس کا نام حوا ہے اور اس کو ہم نے تمہاری رفاقت اور تمہارے انس کے لئے پیدا کیا ہے۔ حضرت آدم

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو چھونے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو وحی کے ذریعے اللہ کا حکم پہنچا کہ آپ اس وقت تک اسے نہیں چھو سکتے جب تک کہ اس کا مہر ادا نہ کریں۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ اے پروردگار! اس کا مہر کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس کا مہر یہ ہے کہ محمد اور آلِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر دس بار درود بھیجا جائے۔ حضرت آدم نے دریافت کیا کہ اے اللہ! محمدؐ کون ہیں؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم آپ کی اولاد میں سے وہ ذات ہے جو خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں اور ان کی اہمیت یہ ہے کہ اگر ان کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو تمہیں یعنی آدم کو بھی پیدا نہ کیا جاتا۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دس مرتبہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر درود بھیجا اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ دونوں کے مابین عقدِ نکاح قائم ہوا، اور اس جمعہ کے آخری حصے میں فرشتوں کو حکم ملا کہ یاقوت اور سچے موتیوں کے زیور اور لباسِ زینت سے حضرت حوا کو آراستہ کر کے دونوں کو جنت میں داخل کر دیا جائے۔

مولوی صاحب، کراچی کے اونچے طبقے کے نکاح خواں ہیں۔ انہیں بتانا چاہیئے تھا کہ یہ نکاح جس کا انہوں نے اس طرح ذکر فرمایا ہے جیسے وہ اس کے عینی شاہد ہوں، پڑھایا کس نے تھا، اور آیا چھوہارے بھی بٹے تھے یا نہیں؟

یہ وہ بزرگوار ہیں جو آئے دن فرمایا کرتے ہیں کہ اسلامی قانون کے متعلق ہم سے پوچھا کرو۔ "بھلا" تم کیوں پوچھتے ہو؟

شاید آپ نہیں جانتے

کہ "طلوعِ اسلام" پاکستان کے علاوہ بائیس غیر ممالک میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس میں شائع شدہ اشتہارات یورپ اور امریکہ کے قارئین کی نظروں سے بھی گزرتے ہیں۔ اگر آپ اپنی مصنوعات وغیرہ کو بیرونی ممالک میں روشناس کرانا چاہتے ہیں تو "طلوعِ اسلام" میں ان کا اشتہار شائع کرائیے۔ آج ہی ایک کارڈ لکھ کر نرخ اشتہارات طلب فرمائیں۔

(ناظم ادارہ)

خورشید عالم

یورپ کا عالمی کردار [۲]

یورپ کے عالمی کردار کا مطالعہ پہلی بار اپریل ۱۹۶۷ء کے "طلوع اسلام" میں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد جو کردار بھی ہر مہینے سامنے آتے وہ متفرق بھی تھے اور متضاد بھی۔ تاہم ان سب کے ضمن میں یورپ کے کردار کا تذکرہ لازماً آیا۔ کہ واقعہ تو کیا انسان کے اعصاب تک پر یورپ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ اس کو درمیان میں لائے بغیر کسی عالمی مسئلے پر گفتگو نہیں ہو سکتی۔ یورپ کے کردار کو ہم نے زمین، سمندر اور خلا تک میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس پہلو بہ پہلو مطالعہ سے اس کردار کا مناسب احاطہ ہو جانا چاہیئے لیکن نہیں — سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے! — ورق تمام ہو سکتا ہے اور ہو گیا ہے مگر یہ داستان مکمل نہیں ہوتی۔ زمانہ اس داستان کو بڑے غور سے سنتا چلا آیا ہے اور اب انسان اسے کہتے کہتے سو نہیں جائے گا جاگ اُٹھے گا۔ انسان کس حد تک جاگنے لگا ہے اس کا اندازہ اضطراب و خلفشار کے ان مظاہر اور مناظر سے ہوتا ہے جو یورپ کی شاخ سے پھولوں کی طرح پھوٹنے لگے ہیں۔ انسانیت کے جوہر اس شاخ کی تنگنا میں صدیوں پیچ و تاب کھاتے کھاتے اب جلوہ گہِ رنگ و بو تک پہنچتے چلے آ رہے ہیں۔ حال ہی میں فرانس میں جو کچھ ہوا اور ہوتا جا رہا ہے اور جو کچھ یورپ میں ہوتا دکھائی دے رہا ہے اس سے یوں لگتا ہے کہ فطرت یورپ کی گہرائیوں سے ایک نیا آدم ابھار رہی ہے جس سیلابِ بلا سے یورپ قوموں قوموں کے گھروں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جانے کی فکر اور کوشش میں لگا رہا اب وہ سیلابِ بلا الٹا بہنے لگا ہے اور جو گھر اس کی زد میں آ کر بہتا دکھائی دے رہا ہے وہ اسی یورپ کا وہی گھر ہے جسے اس نے مشینوں کے زور سے بنایا اور مشینوں ہی کے سہارے قائم رکھا۔ وہ انسان جو مشینوں کی آندھیوں کے گرد و غبار میں روپوش سا ہو گیا تھا، اپنے آپ میں آ کر باگ اور رکاب تھامنے میں لگ گیا ہے۔ اب وہ رخشِ مشین کا مرکب نہیں راکب ہوگا۔

یورپ مشین کے زور پر ابھرا اور مشین کے زور سے دنیا پر چھا گیا۔ عہدِ یورپ میں مشین کو ایسی اولیت حاصل ہوئی کہ انسان کی حیثیت ثانوی ہو کے رہ گئی۔ جب تک مشین کا ایندھن غیر یورپی دنیا سے مہیا ہوتا رہا مشین اور انسان کا باہمی رشتہ نمایاں ہو کر سامنے نہ آیا لیکن آہستہ آہستہ مشین کو ایسا فروغ حاصل ہوا کہ نظر آنے لگا کہ مشین انسان

کے بعد اور انسان کے علاوہ ایک اور نوع معرض وجود میں آکر ارتقاء کی راہ پر گامزن ہوگئی ہے اور انسان بہ حیثیت نوع متحجر .... ہو کے رہ گیا ہے۔ زندگی نے طویل ارتقائی مسافت طے کر کے انسان کی سطح پر پہنچ کر شخصیت اور خودی کا جو منفرد امتیاز حاصل کیا تھا اسے سائنس کی حیران کن ایجادات ختم کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مشینیں زیادہ سے زیادہ خودکار ہو کر انسان کو بے دخل اور بے دست و پا بناتی جا رہی ہیں۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے تو انسان کو ایک شے بنا دیا ہے۔ اس کی شخصیت مشین کے ہاتھوں بُری طرح مجروح ہوئی ہے اور وہ مشین کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے اور اپنی انسانی حیثیت کا اعتراف کرانے پر مصر ہے۔ مشین کتنی ہیبت ناک اور خودکار کیوں نہ ہو یہ انسانی خودی کے منافی ہے کہ وہ انسان کو ایک شے یا لاشے بنا دے۔ شے یا لاشے مشین ہے انسان نہیں۔

یورپ کے انسان کی خودی مشین کے ہاتھوں اس قدر مجروح ہو چکی ہے کہ وہ پیچ و تاب کھا کر مشین اور مشین کی پیدا کردہ تہذیب کا باغی ہو گیا ہے۔ مشین اور مشینی تہذیب نے یورپ کو بڑی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ اس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں، دولت کی ریل پیل ہوگئی، زندگی کی آسائشوں اور لذتوں کا کچھ ٹھیک نہ رہا۔ یورپ کا قریہ قریہ فردوس کی مانند ہوگیا لیکن انسان کہاں گیا؟ ـــ یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے! مشین کے سانپ نے انسان کو جنت سے نکالنا شروع کر دیا۔ اس سے انسان اور مشین میں تصادم کی طرح پڑ گئی۔ اسے بجا طور پر شخصیت اور مشین کی کشمکش کا نام دیا گیا ہے۔ یورپ میں اس کشمکش نے عجیب دور دیکھے۔ نوجوانوں کے قافلوں کے قافلے گھروں سے نکل آئے۔ ان کے سامنے کوئی مقصد نہ تھا۔ سائنس کی عطا کردہ فراوانی نے انہیں ایک بے مقصد لیکن خودکار مشین بنا دیا۔ یہ "بیٹلز" موج بے باک کی طرح جدھر منہ نکلے بہتے چلے گئے۔ کوئی سوال ان کے سامنے نہیں تھا۔ انہوں نے بال حلیہ بگاڑا۔ اور شکلوں میں نر و مادہ کی تمیز تقریباً ختم کر دی۔ معاشرتی اقدار اور انسانی ضوابط ان کے لئے بے معنی ہو گئے۔ بیٹلز ایک نئی، درمیانی، گم گشتہ نوع بن گئے۔ نہ وہ انسان رہے نہ مشین بن سکے۔ یورپی حکومتوں نے اسے انسانی مسئلہ نہیں سمجھا بلکہ اسے سیاست کی عینک سے دیکھا اور اس میں اپنا بھلا اور بچاؤ دیکھا کہ نوجوان شراب پی پی کر ناچ ناچ کر حلیہ بگاڑ بگاڑ کر اپنے حال میں مست رہیں اور ارباب اقتدار کو مزے سے حکومت کرنے دیں۔

بیٹلز کی شاخ سے ایک اور کونپل پھوٹی۔ یہ بھی نوجوان تھے اور ہپیز .... کہلاتے۔ انہوں نے شعوری طور پر کم اور غیر شعوری طور پر زیادہ اس سطحی تابناکی کے خلاف بغاوت کی جو یورپ کا طرۂ امتیاز تھی۔ جسم کی روشنی، ظاہری صفائی، ٹھاٹھ کا رہن سہن: انہوں نے یکقلم ترک کر دیا۔ جسم اور لباس کی صفائی کو انہوں نے غیر ضروری سمجھا۔ وہ ملنگ بن کر نکلے اور جوق در جوق مشرقی ممالک میں آ پہنچے۔ مانگ مانگ کر کھانا اور بھنگ اور چرس کا نشہ کرنا ان کی عادت بن گیا۔ مشرق کی ایک حد تک غیر مادی تہذیبی فضا میں انہیں امان مل سکی یا مل سکے گی؟ اس کا جواب دینا آسان نہیں۔ یہ بہر حال یقینی ہے کہ مغرب کی مشینی اور غیر معمولی فراوانی کی زندگی نے انہیں زندگی تک سے بیزار کر دیا

ہے۔ اور وہ گردشِ ایام کو دوڑا کر پیچھے کی طرف وہاں تک لے جانے میں لگے ہوتے ہیں جہاں مشین کے ذریعے انسانی خودی کی پامالی کا تصور بھی نہ کیا جا سکے۔ ہٹلیز اور ہپیز مجسم تردید ہیں اس یورپی ذہنیت کی کہ انسان از سرتاپا جسم ہی جسم ہے اور اس کے دائرۂ حیات کے خطر کے انتہائی نقطے شکم و جنس ہیں۔ یورپ نے شکم و جنس کی تسکین کے رنگا رنگ اور فراواں سامان کئے۔ یہ سامان اس جسم کے اندر کے انسان کا دل ایک حد تک ہی بہلا سکے۔ وہ بالآخر تڑتڑا کر اٹھ بیٹھا اور ان ظواہر پر لعنت بھیجنے لگا اور اپنا حال حلیہ بگاڑ کر تہذیبِ یورپ پر زبانِ حال سے طنز کرنے لگا اور کہنے لگا۔

؎ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

یورپ کا انسان مشینوں کے ہاتھوں رسوا ہوا سو ہوا، وہ اپنے ہاتھوں کم ذلیل و خوار نہیں ہوا۔ اور یہ سلسلہ چلتا چلا جا رہا ہے۔ یورپ کا نظمِ سیاسی، مشرق کا اشتراکی بھی اور مغرب کا جمہوری بھی، احترامِ آدمیت پر مبنی نہیں۔ یورپ کی کھیتی میں مشیت نے بڑے عمدہ بیج بوئے۔ لیکن اس نے یہی کوشش کی کہ وہ زیرِ زمین ہی گل سڑ جائیں اور ان سے کوئی کونپل نہ پھوٹ سکے۔ مارٹن لوتھر کی بغاوت کے ذریعہ یورپ کو جتایا گیا کہ پاپائیت انسان کے لئے بہت بڑی لعنت ہے۔ انقلابِ فرانس نے شہنشاہیت کے تصور کی بنیادیں ہلا دیں اور مارکسیت نے معاشی استحصال کے استیصال کی طرح ڈالی۔ یہ تحریکیں بھی یورپ میں وہ انقلابِ شعور نہ پیدا کر سکیں جو اس کے فکر و کردار کے پیمانے بدل کے رکھ دیتا۔ ایک بلائے قومی کلیسا سے یورپ کو نجات ملی تو ایک ایک قوم نے اپنا علیحدہ قبائلی کلیسا قائم کر لیا۔ شہنشاہیت ختم ہونے سے جمہوریت کا دور دورہ ہوا تو موروثی حکمرانوں کی جگہ منتخب حکمرانوں نے لے لی۔ جمہوری دور بھی سلطانیٔ جمہور کا زمانہ بن نہ سکا اور زمینِ یورپ میرِ سلطان سے بیزار ہونے کے باوجود اس نقشِ کہن کو مٹا کر آبروئے انسانیت کا تحفظ نہ کر سکی۔ (روسی) اشتراکیت نے "نان" کا مسئلہ حل کیا یا نہیں وہ "جان" کا مطلق پاس نہ کر سکی۔ وہ کہنے کو عوامی تھی عملاً خواص ہی کی رہی۔ کوئی بتیس سال پہلے یورپ کے کردار کو دیکھ کر اقبال کہہ اٹھا تھا کہ ؎

بیا کہ سازِ فرنگ از نوا بر افتاد است
درونِ سینۂ او نغمہ نیست فریاد است

اس وقت اقبال کی آنکھ ہی اس طوفانِ انقلاب کو دیکھ سکتی تھی جو ضمیرِ یورپ میں برپا تھا۔ عام نگاہوں سے یہ چیز بالکل اوجھل تھا۔ یورپ نے جَو کو گندم کہہ کر بیچنے کی ایسی جسارت پیدا کر لی تھی اور اس کی تابناکی اس قدر تیز تھی کہ کوئی یہ ماننے کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا تھا کہ سازِ یورپ کے تار ٹوٹتے جا رہے ہیں اور اس کے سینے سے نغمے نہیں بلکہ فریادیں بلند ہونے لگی ہیں۔ یورپ کے زخمہ ور کی چیرہ دستی نے اس واویلے کو ایک زمانہ بہت نیچے سروں میں رکھا۔ ہوتا کچھ اور رہا اور یورپ سمجھتا اور سمجھاتا کچھ اور رہا۔ تدبیر کا وہ شاطر تھا اور تقدیر کو مات دینے میں لگا رہا۔

اس صدی کے نصفِ اول میں تو اس نے یقین سا دلا دیا کہ یورپ کشتِ انسانیت نہیں بن سکے گا۔ یورپ پہلی

جنگِ عظیم کی تباہی کی بمشکل تلافی کر پایا تھا کہ اس کی شامتِ اعمال نے دوسری جنگِ عظیم کی قیامت لا کھڑی کی ۔ یورپ دوبارہ پسا اور دوسری بار پہلی بار سے کہیں زیادہ پسا۔ اسے نیم جان دیکھ کر دو طاقتیں آگے بڑھیں جو یورپ ہی کی عظمت کے تقدس اور تحفظ کی خاطر میدانِ جنگ میں اتر آنے کی دعویدار تھیں۔ ایک طرف روس تھا، دوسری طرف امریکہ۔ روس مرتے مرتے بچا تھا لیکن بچ گیا تو اس کو دیگر اقوامِ یورپ کے مقابلے میں زندہ تر سمجھا جانے لگا۔ اس کی وجہ اشتراکی عقیدے اور تصور کی مزعومہ قوت تھی۔ امریکہ روس کے مقابلے میں کہیں زیادہ قوی تھا۔ اس کا گھر لڑائی کی دستبرد سے محفوظ رہا تھا اور اس نے ایٹم بم بھی بنا لیا تھا۔ مشترک دشمن کے خلاف مشترک مقصد کے تحت لڑنے کے باوجود روس اور امریکہ کی باہمی رقابت جنگ کے آخری دنوں میں بطورِ خاص نمایاں ہونے لگی۔ وہ جرمنی کے خلاف لڑتے لڑتے بھی اپنے درمیان خطِ تقسیم کھینچنے میں لگ گئے۔ جنگ ختم ہوئی تو واضح حدِ فاصل بن چکی تھی۔ یورپ کو دونوں نے یوں آپس میں بانٹا کہ جرمنی جیسا ملک اپنے دارالحکومت برلن سمیت تقسیم ہو گیا۔ دونوں نے اپنے اپنے یورپوں کو اپنی اپنی جاگیر سمجھ کر ان کی تنظیم اور اپنی مرضی کے مطابق شروع کر دی۔ چنانچہ مشرقی یورپ اشتراکی لہٰذا روسی ہو گیا اور مغربی یورپ امریکی بن گیا۔ جملہ اقوامِ یورپ ان دونوں اعلیٰ قوتوں کے رحم و کرم پر تھیں اور مجبوراً ان کی حلقہ بگوش بن گئیں۔ امریکہ نے مغربی یورپ کو مارشل منصوبے کے تحت معاشی طور پر اور نیٹو تنظیم کے ذریعے عسکری طور پر مشرقی یورپ لہٰذا روس کے خلاف تیار کیا۔ روس نے مشرقی یورپ کو اشتراکیت کی لاٹھی سے ہانکا اور معاہدہ وارسا کی وساطت سے مغربی یورپ لہٰذا امریکہ کے خلاف ایک عسکری سلسلے میں منسلک کر لیا۔

یوں دو یورپ معرضِ وجود میں آ گئے جو بیرونی طور پر ایک دوسرے کے حریف تھے اور اندرونی طور پر آپس میں غیر مربوط۔ یہ حیثیت ایک حد تک ہی برقرار رہ سکتی تھی کیونکہ امریکہ اور روس کی سیاست کے تقاضے ممالکِ یورپ کے مزاج کے تقاضے نہ تھے نہ ہو سکتے تھے۔ یوگوسلاویہ شدید مخالفت کے باوجود اشتراکی حلقے سے نکل آیا اور قومی اشتراکیت کا نقیب بن گیا۔ نظریہ اس کا جیسا کچھ بھی رہا وہ روس کا حلقہ بگوش نہ رہا۔ ہنگری نے کوئی بارہ سال پہلے آزادروی اختیار کرنا چاہی تو روس نے سختی سے اس رو کو کچل دیا۔ آہستہ آہستہ خود روس میں بھی آزادروی پیدا ہونے لگی اور اشتراکی دنیا میں تعلقات کی نوعیت بدلنے لگی۔ رومانیہ نے اپنے آپ کو اچھا خاصا آزاد کر لیا۔ پولینڈ اور چیکوسلواکیہ میں بھی اس کی دیکھا دیکھی تبدیلیاں آتی جا رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں کا باعث ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ یہ ممالک روس کے حلقہ بگوش بن کر نہیں بلکہ اپنی صوابدید کے مطابق اپنے معاملات کا خود انتظام کرنا چاہتے ہیں۔

مغربی یورپ میں بھی اسی طرح کی آزادی کی رو چلے بغیر نہ رہ سکی۔ وہاں نمایاں طور پر فرانس نے خود پسندی اور خود نمائی کا مظاہرہ کیا اور امریکہ کی بالادستی کو زک پہنچانے لگا۔ اس نے امریکہ کی مخالفت کے علی الرغم اپنا جداگانہ ایٹمی اسلحہ کا ذخیرہ قائم کیا اور اقیانوس سے یورال تک واحد یورپ کا خواب دیکھنے لگا۔ اس تصور کے پیشِ نظر اس

نے نیٹو سے قطع تعلق کر لیا اور اسے فرانس سے بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح فرانس امریکہ کے اثر و تسلط سے آزاد ہونے لگا اور انفرادی اور جداگانہ حکمت عملی اختیار کرنے لگا۔ فرانس کا یہ طرز عمل امریکہ کے خلاف بغاوت تھا اور اس کا واشگاف اعلان کہ کوئی قوم اعظم و اقویٰ ہو سکتی ہے لیکن اس کی عظمت و قوت اسے کسی دوسری قوم پر مسلط ہونے کا جواز مہیا نہیں کر سکتی۔

اس طرح یورپ میں آزادی کی رو شروع ہوئی۔ یہ رو امریکہ اور روس جیسی یورپ نژاد اور یورپ پرور طاقتوں کے یعنی اپنوں ہی کے تسلط کے خلاف تھی۔ گویا یورپ اپنی گلو خلاصی یورپ یعنی اپنے آپ سے کرا رہا تھا۔ مشرقی یورپ کے ممالک اشتراکی ہونے کے باوجود اشتراکی روس کی بالادستی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور مغربی یورپ کے ممالک غیر اشتراکی بلکہ اشتراکیت سے خائف اور نالاں ہونے کے باوجود امریکہ کی اطاعت اپنی قومی خودداری کے منافی سمجھتے ہیں۔ وہ سیاست، معیشت اور معاشرت میں بنیادی اختلافات رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے تعاون ضروری اور مفید سمجھنے لگے ہیں۔ یورپی زندگی کا یہ پہلو اپنی جگہ اہم اور خوش آئند ہے لیکن اس تعمیر میں خرابی کی جو صورت مضمر ہے وہ نمایاں ہونے لگی ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے فرانس کی مثال کو سامنے رکھنا چاہیئے۔

فرانس نے امریکی تسلط کے خلاف جرأت مندانہ بغاوت کی اور بڑے سلیقے سے اس کے اثرات مشرقی یورپ تک پہنچائے اور روس اور امریکہ کے اثر سے بے نیاز ایک نئی یورپی طاقت ابھارنے کے سامان پیدا کئے۔ فرانس نے پہلے فرانس کی آزادی اور عظمت کا تصور ابھارا اور پھر اسے یورپ کی وحدت اور عظمت سے ہم آہنگ کیا۔ فرانس کی حکمت عملی زیادہ تر ڈی گال ایسے قائد کی مرہون منت ہے۔ ایسے قائد قوموں کو کبھی کبھی نصیب ہوتے ہیں۔ فرانس کو ڈیگال اس حال میں ملا کہ اسے اس قائد کی اشد ضرورت تھی۔ ڈیگال نے بڑی پامردی سے اور بتدریج فرانس کی عظمت کا تصور عملاً متشکل کیا۔ وہ دس سال سے اس ملک کی قسمت کا مالک ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے فرانس کو ایک شکست خوردہ قوم کے درجے سے ابھار کر پھر سے یورپ کی عظیم قوم بنا دیا ہے۔ لیکن ذرا امعانِ نظر سے دیکھا جائے کہ ڈی گال نے کیا کیا تو عجیب سماں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے گا۔

ڈیگال کی سیاست کا محرک یہ تصور ہے کہ اقوام عالم کا محور یورپ ہے، یورپ کا فرانس اور فرانس کا ڈیگال۔ ڈیگال نہ ہوتا تو فرانس کی عظمت کا سوال پیدا نہ ہوتا۔ فرانس نہ ہوتا تو روس اور امریکہ کے دوگونہ تسلط میں یورپ کو کوئی نہ پوچھتا۔ یورپ نہ ہوتا تو دنیا تہذیب و تمدن سے محروم ہوتی۔ گویا ایک گائے اپنے ایک سینگ پر پوری دنیا یوں اٹھائے ہوئے ہے کہ سینگ کی لرزش خفی بھی دنیا بھر میں زلزلہ برپا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ شخصی، فرانسیسی اور یورپی نقطۂ نگاہ سے یہ تصور خوش کن بلکہ نشہ آور سہی، انسانی نقطۂ نگاہ سے مذموم و مردود ہے۔ یہ تصور اس فرانس اور فرانس کے اس قائد کا ہے جو روس اور امریکہ جیسی طاقتوں کے اثر کو بجا طور پر کم کرنے

میں لگا ہوا ہے۔ وہ ایک زہر کو کم کر کے دوسرا زہر پی اور پلا رہا ہے۔ زہر بہرحال زہر ہے۔ روس سے آئے تو بھی، امریکہ سے آئے تو بھی، اور فرانس سے آئے تو بھی۔ ہر زہر جسدِ سیاست کو لامحالہ زہرناک بنائے گا۔ اور یورپ کا جسد اس حد تک زہرناک ہو چکا ہے کہ اس کی رگ رگ سے زہر پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا ہے۔ جو طلبا فرانس میں پاگلوں کی طرح اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے مدنی زندگی کو معطل کر کے رکھ دیا۔ وہ طائرانِ پیش رس ہیں اس انقلابِ عظیم کے جس کی لپیٹ میں یورپ آچکا ہے۔ وہ کسی ایسے "باپ" کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں جو اولاد کو جوان نہ ہونے دے اور بلوغت کے بعد بھی انہیں انگلی پکڑ کے چلائے۔ ان کا احتجاج غیر شعوری بغاوت ہے اس ظلم صریح و مسلسل کے خلاف جس کا مرتکب یورپ چلا آرہا ہے اور جو انسان کی انسانیت کو کچلے چلا جا رہا ہے۔

یورپ اس سیلابِ بغاوت کے سامنے اب نہ کوئی بند باندھ سکتا ہے نہ اسے غلط راہوں پر ڈال کر اس کا رُخ موڑ کر اپنے علاوہ کسی اور سمت میں کر سکتا ہے۔ اس صدی میں دو موقعے ایسے آئے جب یہ لاوا پھوٹ بہتا اور یورپ کی کایا پلٹ کے رکھ دیتا۔ ایک رُبع اول میں دوسرا رُبع ثانی میں۔ دونوں بار یورپ کو عالمگیر جنگ رچا کر اس کا زور توڑنے کا بہانہ مل گیا۔ اب آسانی سے تیسری جنگ نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسی غیر معمولی اور ہمہ گیر تباہی کے آلات بن چکے ہیں، اور بنتے جا رہے ہیں، کہ سوال کسی کی فتح و شکست کا نہیں سب کی یکساں تباہی کا ہو گیا۔ اب کوئی بڑی طاقت لڑائی کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں۔ یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے۔ ایک طرف روس اور امریکہ کی سائنسی صناعی کا یہ عالم ہے کہ وہ خلا تک میں دخیل ہو کر ستاروں کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے پر قادر ہونے لگے ہیں کہ انہیں اپنی مرضی سے مدار سے ہٹا کر زمین پر جہاں چاہیں گرائیں اور اس حصے کو تباہ کر دیں، وہاں مجبوری کا یہ حال ہے کہ تباہی کا جہنم بھڑکا کے اس کے دروازے مقفل کئے جا رہے ہیں اور ان کی چابیاں مشیت کے سپرد کر دینے پر مجبور ہیں کہ وہ چاہے تو انہیں کھولے ورنہ مقفل کے مقفل رہنے دے۔ مشیت نے ان چابیوں کی مدد سے وہ دوسرا جہنم کھول دیا ہے جو یورپ کے دل میں صدیوں سے دہکتا چلا آرہا ہے اور جس کا ایندھن یورپ، بیرونِ یورپ سے تلاش کر کر کے لاتا رہا تھا۔ تیسری جنگ کے کم و بیش خارج از بحث ہونے سے ایک نئی جنگ شروع ہو گئی ہے جو تیسری عام جنگ شروع ہو سکتی تو شاید کبھی شروع نہ ہوتی۔

عالمی حالات کو دیکھا جائے تو صاف پتہ چلے گا کہ یورپ پسپا ہو کر اپنی حدود میں سمٹنے پر مجبور ہوتا جا رہا ہے اور جوں جوں وہ سمٹتا ہے اس کے اندر سے ایسے دھارے پھوٹتے چلے آتے ہیں جو اس انبارِ خس و خاشاک کو بہا لے جانے کے ضامن ہوں گے جو وہ صدیوں سے انسانیت کا راستہ روکنے کے لئے جمع کرتا چلا آیا تھا۔ اس نے زمین سے ابھر کر فضا اور خلا تک کو اپنی جولانگاہ بنا لیا ہے لیکن اس کے راستے مسدود ہوتے ہیں،

کھلے نہیں۔ امریکہ کے پاس صرف ایٹم بم تھا تو اس نے بڑی دیدہ دلیری سے جاپان کے خلاف استعمال کر دیا تھا۔ اب وہ اس سے کہیں زیادہ تباہ کن آلات رکھنے کے باوجود مجبور ہے کہ کوریا اور ویٹ نام میں پٹے اور عاجز آکر دنیا کے ایک ایک دارالحکومت کی خاک چھان چھان کر یہ درخواست کرتا پھرے کہ مقامی حریت پسندوں کو صلح کے لئے نہیں صلح کی گفتگو کے لئے آمادہ کیا جائے۔ اسی طرح ڈالر اور برطانوی پونڈ دو ایسے زر ہیں (یا تھے) جنہیں دوسرے ممالک سونے کے ذخائر کے ساتھ سونے کے برابر سمجھ کر محفوظ رکھنا ضروری اور مفید سمجھتے تھے۔ اب ڈالر اور پونڈ کی شہنشاہیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ڈالر کو بے وقار ہونے سے بچانے کے لئے امریکہ مجبور ہو گیا ہے کہ وہ دنیا میں اس کا پھیلاؤ کم کرے۔ اس کے لئے اس نے سیاحوں تک پر پابندیاں لگا دی ہیں تاکہ ڈالر امریکہ سے زیادہ تعداد میں باہر جا کر کاغذی پیپر نہ بن جائے۔ یہ اصول درست ہے لیکن جب تک امریکہ ویٹ نام میں موجود ہے ڈالر رسوا ہونے سے بچ نہیں سکے گا۔ اپنے ڈالر کو بچانے کے لئے اسے زود یا بدیر ویٹ نام سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ یہ دستبرداری اس کے لئے آسان نہیں کیونکہ اس کی معیشت کا دار و مدار ہی اس جنگ پر ہے۔ گویا جو جنگ اس کی معیشت کو فروغ دینے کا موجب ہے وہی اسے تباہ بھی کرتی جا رہی ہے۔ امریکہ جیسے اعظم اور اقویٰ ملک کے لئے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن' والی بات ہو گئی ہے۔ یہی نہیں' وہ کچھ کرتا ہے تو' اور نہیں کرتا تو' ملک کے اندر اضطراب و خلفشار ہر حال میں ابھرتا ہے۔ پہلے یورپ کا کردار یہ تھا کہ وہ دنیا کے ساتھ کیا کر رہا ہے اور اب اس کا کردار یہ ہے کہ مشیت اس کے ساتھ کیا کر رہی ہے۔ اب یورپ کر نہیں رہا اس سے ہو رہا ہے۔

اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی ایک جگہ نہیں ہو رہا۔ یورپ اپنے بچاؤ کے لئے جو حرکات مذبوحی کر رہا ہے اسکا اثر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا ہے اور بات رد کے نہیں رکتی۔ یورپ نے اپنے نوجوانوں یعنی معاشرے کی ابھرتی قوت کو شکم کا فریب دیا جنس میں الجھایا اور عشیش کا سبز باغ دکھایا لیکن اس مسافر کی تسکین کہیں نہ ہو سکی۔ کوئی چیز شبنم کی طرح اس کے سینے پر گر کر اسے یاد دلاتی رہی اور ابھارتی رہی کہ شکم' جنس اور عشیش میں نہ زندگی ہے نہ آبرو۔ زندگی اور آبرو انسانی خودی کی پرورش و نشوونما میں ہے لیکن اس کی گنجائش کہاں؟ جمہور کی حیثیت تو چوپایوں کی طرح ہے بلکہ ان سے بھی گئی گذری۔ سرمایہ داروں کی جمہوریت ہو یا روسی اشتراکیت کی عوامی جمہوریت' دونوں انسانی خودی سے خراج کی متقاضی ہیں۔ انسانی خودی کا تقاضا تو یہ ہے کہ جہاں مشیت نے جمادات، نباتات اور حیوانات کو اپنے قانون کا پابند بنا دیا ہے وہاں انسان کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ جو ضابطہ حیات اسکی اپنی فلاح و بہبود کے لئے بذریعہ وحی اس تک پہنچا اسے بصیرت و تفکر سے کام لے کر مانے تو مانے ورنہ چھوڑ دے۔ اس کے علاوہ اس نے پیغمبر تک کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ جمہور سے کہے کہ اس کے بندے بن جائیں۔ پیغمبر بھی قانون خداوندی کی اطاعت کرنے اور کرانے پر مامور ہے۔ یورپ کے انسان کو یہ آزادی کبھی نصیب نہیں ہوئی' اور اسے

سلب اپنے ہی کرتے رہے اور آزادی ہی کا واسطہ دے کر آزادی کو مسخ کرتے رہے۔ انقلابِ فرانس نے یورپ کو سلطانی جمہور کا خواب تو دکھایا لیکن اس کے مقدر میں وہی آمریت کی آمریت۔ جمہوریت نے آکر آمریت کا نام بدل دیا، اصل اس کی وہی رہی۔ جب تک یورپ بیرونی دنیا میں الجھا ہوا تھا اس کے اندر سے ایسا لاوا پھوٹ کر بہ نہ سکا جو انسانی خودی کے منافی تصورات کی آبادیوں کو خاکستر کر دیتا لیکن اب جب یورپ اپنی حدود میں سمٹنے لگا ہے مشیت اسے اپنے آپ میں لانے میں لگ گئی ہے۔ یورپ نے ہیجان و اضطراب کی علت و غایت بعینہٖ یہی ہے گو ماکرین یورپ اپنے اپنے مکتے اس پر پردے ڈال کر غلط توجیہہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ڈیگال کہتا ہے کہ یہ فساد اشتراکیت کا پیدا کردہ ہے۔ اہلِ فرانس نے ڈیگال کو ہٹا دیا تو اشتراکیت کا غلبہ ہو جائے گا۔ روسی اشتراکیت کو خوش فہمی ہے کہ یہ اس کی کامیابی کے واضح آثار ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں رائج الوقت نظریات ایک کٹھالی میں ڈال دیئے گئے ہیں مشیت انہیں سرمے کی طرح پیس رہی ہے۔ یہ سرمہ پوری طرح پس کر انسان کی آنکھ تک پہنچے گا تو اس پر وہ عالم روشن ہو جائے گا جس میں شرف و مجدِ انسانیت کا یہ ازلی قانون جاری و ساری ہو گا کہ "سبھی ربانی ہیں" کوئی حاکم نہیں، کوئی محکوم نہیں — سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے! — یورپ کا کرب و اضطراب پتہ دے رہا ہے کہ اس کی رات سحر ہوتی جا رہی ہے اور اس زمین کے اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھنے کے یقینی آثار پیدا ہو گئے ہیں!

پیشگی خریداری

آپ ایک روپے کی کتاب منگواتے ہیں تو اس پر کم از کم بارہ آنے ڈاک کے خرچ آجاتے ہیں اگر آپ اپنے آپ کو پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل کر لیں تو آپ کا یہ سارا خرچ بچ سکتا ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ آپ مبلغ ایک سو روپیہ پیشگی جمع کرا دیں۔ اس کے بعد آپ جو کتاب طلب فرمائینگے وہ بغیر ڈاک خرچ آپ کو بھیج دی جائینگی۔ رسالہ طلوع اسلام کا چندہ بھی اسی سے وضع کر لیا جائیگا اور آپ کا حساب باقاعدہ آپ کو بھیجا جائے گا۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

باب المراسلات

پیری مریدی کا زور

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد ملک میں پیری مریدی' اور اس کے متعلقات۔ قبر پرستی۔ گنڈہ تعویذ وغیرہ' کا بہت زور ہو گیا ہے۔ اور جوں جوں وقت گذرتا جا رہا ہے یہ چیزیں اندر زور پکڑتی جاتی ہیں۔ اور حیرت یہ ہے کہ (اس سے پہلے یہ چیزیں بالعموم جہلا کے طبقہ تک محدود ہوتی تھیں لیکن اب) یہ لکھے پڑھے طبقہ' بالخصوص سرکاری ملازمین' میں بھی عام ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

طلوعِ اسلام

یہ سوال اس سے پہلے بھی' (ایک عرصہ ہوا) ہم سے پوچھا گیا تھا اور اس کا جواب طلوعِ اسلام کے صفحات میں دیا گیا تھا لیکن اس کے بعد' یہ چیزیں' وبائی امراض کی طرح اور شدت سے پھیل رہی ہیں' اس لئے اس سوال کا دوبارہ جواب دینا ضروری سمجھا گیا ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ:

(۱) کائنات میں ہر شے کے لئے ایک قانون مقرر ہے۔ قانون کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں۔

(۲) اصول یہ ہے کہ لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ انسان اسی کا حقدار ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔

(۳) یہی وجہ ہے کہ اس نے میسرہ کو حرام قرار دیا ہے۔ میسرہ کا عام ترجمہ جوا کیا جاتا ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ میسرہ کے معنی ہیں وہ دولت جو آسانی سے ہاتھ آ جائے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے، قوم نے اسے لوٹنا شروع کر دیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ قوم نے بہ حیثیت مجموعی قاعدہ اور قانون کو بالائے طاق رکھ کر میسرہ کو اپنا شعار بنایا۔ قاعدہ اور قانون کے مطابق کام کرنے میں، محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے اور انسان راتوں رات "سیٹھ" بھی نہیں بن سکتا۔ "لوٹ" میں یہ دونوں باتیں ممکن ہیں۔ یعنی اس میں محنت کچھ کرنی پڑتی نہیں اور انسان شباشب لاکھ پتی بن جاتا ہے۔ یہ "مالِ غنیمت" (لوٹ کا مال) تو چند دنوں میں ختم ہو گیا لیکن قوم کو میسرہ کی ایسی لت پڑ گئی کہ اس نے اسی کو اپنا شعارِ زندگی بنا لیا۔ اب ہر شخص اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا کہ نہ محنت کرنی پڑے اور نہ ہی قاعدہ اور قانون کی پابندی، اور وہ "سیٹھ" بن جائے راتوں رات۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خلافِ قانون راستوں کی تلاش ہو گی۔

اس کے ساتھ ہی (بدقسمتی سے) ملک کا نظام سرمایہ داری قرار پا گیا۔ یہ نظامِ میسرہ کی بدترین شکل ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ہماری قوم محنت کش اور مزدوری پیشہ تھی۔ اب لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص ایک کمرے میں میز کرسی لگا کر بیٹھ جاتا ہے، نہ کہیں آتا ہے نہ جاتا، نہ محنت کرتا ہے نہ مزدوری۔ چار کاغذ ٹائپ کرتا ہے اور دس ٹیلیفون۔ اور چھ ماہ کے بعد دیکھئے تو لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ اس سے ہر شخص کے منہ میں پانی بھر آیا اور انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ محنت، مشقت اور قاعدے قانون کی پابندی سے بمشکل روٹی ملتی ہے۔ اور اس طریق سے انسان، ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر امیر کبیر بن جاتا ہے۔ اس لئے کیوں نہ یہی راہ اختیار کی جائے۔

قوم کا ایک طبقہ حکومت کی مشینری کا کل پرزہ ہوتا ہے اور اس کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کو قانون کا پابند بنائے۔ جب اس طبقہ نے دیکھا کہ قانون شکنی سے اس قدر منافع حاصل ہو رہے ہیں، تو اس نے دل میں کہا کہ کیا قانون کی پابندی کے لئے ہم ہی رہ گئے ہیں؟ چنانچہ اس کے بعد اس نے بھی یہی روش اختیار کر لی۔ اب صورت یہ ہو گئی کہ افرادِ قوم، خلافِ قانون راہوں پر چلنے کے لئے ان کے پاس پہنچتے اور یہ ان کے ممد و معاون بن کر، اس کی قیمت وصول کرتے۔ اس طرح انہوں نے بھی میسرہ سے اپنا حصہ لینا شروع کر دیا۔

ادھر دنیاداروں نے یہ روش اختیار کی اور ادھر سے "روحانیت" کے مدعیوں کی طرف سے آوازیں آنی شروع ہوئیں کہ آؤ! تمہیں ہم بتائیں کہ بلا محنت و مشقت مرادیں کس طرح پوری ہوتی ہیں! فلاں مجذوب سٹہ کا نمبر بتاتے ہیں۔ فلاں حضرت صاحب کی دعا سے کاروبار میں "برکت" پیدا ہو جاتی ہے۔ فلاں بزرگ کے تعویذ سے افسر مہربان ہو جاتا ہے۔ فلاں مزار پر حاضری دینے سے سب رُکے ہوئے کام رواں ہو جاتے

ہیں۔ ظاہر ہے کہ میرو پسند، تن آسان، محنت سے جی چرانے والی، قانون شکنی کی عادی قوم کے لئے اس آواز سے بڑھ کر جاذبیت اور کس میں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے جوق در جوق ادھر کا رخ کر لیا۔ بزرگوں کے آستانوں پر ہجوم لگ گیا۔ خانقاہوں اور مزاروں پر مرادیں طلب کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ چنانچہ اب میرو کے لئے دوہرے راستے اختیار ہونے لگے۔ جب کوئی کام سامنے آیا۔ پہلے یہ سوچا کہ فلاں افسر تک پہنچنے کا ذریعہ اور سفارش تلاش کی جائے۔ دوسری طرف یہ کہ خدا تک اپنی بات پہنچانے کے لئے کسی بزرگ کا وسیلہ حاصل کیا جائے۔ اس سے اگلا قدم یہ کہ افسر متعلقہ کو اس قدر رشوت دی جائے اور حضرت صاحب کے حضور اس قدر نذرانہ گزارا جائے، یا مزار پر منت مانی جائے۔ بادی النظر میں نظر آجائے گا کہ ان دونوں طریقوں میں فرق صرف الفاظ کا ہے۔ روح دونوں جگہ ایک ہی کارفرما ہے۔

یہ معاملات ذرا چھوٹے درجے کے آستانوں پر ہوتے ہیں۔ بڑی مسندوں پر بات اس سے آگے چلی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں فری میسنز یا روٹری کی قسم کی تنظیمیں ہوتی تھیں۔ ان کے ممبر بننے کا ایک بڑا فائدہ (اور دیسی ممبروں کے لئے شاید یہی ایک فائدہ) تھا کہ اس سے بڑے بڑے حکام کے ساتھ روابط پیدا ہو جاتے تھے۔ (آجکل، اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی، لائنز کلب کے نام سے متعارف ہے) بلند آستانوں اور درگاہوں کے مرشدانِ طریقت کے وابستۂ داماں ہونے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ روابط پیدا ہو جاتے ہیں، اور اس میں جو کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے وہ بہرحال مذکورہ صدر کلبوں کے اخراجات سے کم ہی ہوتا ہے۔ علاوہ بریں، اس سے انسان معاشرہ کی نگاہ میں "بھی" "اللہ والا" بن جاتا ہے۔

قوم کو مزاجِ خانقاہیت میں پختہ تر کرنے کے لئے یہی اسباب و علل کچھ کم نہ تھے کہ محکمۂ اوقاف نے سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ کا کام کیا۔ اس سے پہلے چند بڑی بڑی خانقاہوں اور مزاروں کو چھوڑ کر باقی مزارات دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں رفتہ رفتہ مٹتے جا رہے تھے۔ اس محکمہ نے اپنی حسنِ کارکردگی دکھانے کے لئے ان مٹتے ہوئے نشانات کو ازسرِ نو زندہ کر دیا۔ اور اس طرح قدم قدم پہ نئی نئی درگاہیں ابھرنی شروع ہو گئیں۔ پھر اس محکمہ کی طرف سے ان "بزرگوں" کے کوائفِ حیات سے متعلق کتابیں مرتب اور شائع ہونے لگیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کے کوائفِ حیات میں سب سے نمایاں حصہ ان کی کرامات کا ہوتا ہے۔ جب ان کی طرف اس قدر محیر العقول کرامات منسوب ہونے لگیں تو پھر ان کے نشانات کے مرجعِ انام بن جانے میں کسر کونسی باقی رہ سکتی تھی؟ اس سے پہلے مزاروں اور درگاہوں کے مجاور بالعموم جاہل بھی ہوتے تھے اور اخلاقی اعتبار سے بھی ان کی شہرت اچھی نہیں ہوتی تھی اس لئے لوگ ان مراکز کی طرف زیادہ رجوع نہیں کرتے تھے۔ اب ان کی جگہ سرکاری مجاوری نے لے لی ہے جو سب پڑھے لکھے ہیں اور عام طور پر دانشور شمار ہوتے ہیں۔ یہ حضرات ان مزاروں پر اوران

سے متعلق اجتماعات میں وہی حرکتیں کرتے ہیں جو اس سے پہلے جاہل مجاور کیا کرتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس محکمہ کے ملازمین اس باب میں مجبور ہیں۔ جب ان کا وزیر (منسٹر) کسی مزار کو غسل دے تو یہ بیچارے غسل کے پانی کو شیشیوں میں کیونکر نہیں بھریں گے۔ لیکن اس کا نتیجہ بہرحال یہ ہوتا ہے کہ جب عوام انہیں یہ کچھ کرتا دیکھتے ہیں، تو ان کی نگاہوں میں ان خرافات کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ اسباب وعلل جن کی بنا پر پاکستان میں پیری مریدی، قبر پرستی اور خانقاہ نوازی کی روش بڑھتی جا رہی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا علاج کیا ہے تو

علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!

ان توہم پرستیوں کی بنیادی وجہ تو جہالت ہے ــــ جہالت سے مراد ہے قرآن کی تعلیم سے ناواقفیت ــــ اور اس کا علاج یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کو عام کیا جائے جس میں بتایا جائے کہ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) "تصوف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے"۔ یہ تصور ہی غیر اسلامی ہے۔ اسے ہم نے غیروں سے مستعار لیا تھا۔ قرآن کے نظام زندگی میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ کشف وکرامات کی دینی حیثیت کچھ نہیں۔ مُردوں کا اس دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ باقی رہے زندہ بزرگ سو ان کی دعائیں اور نگاہیں بھی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتیں۔ یہ ہماری اپنی عقیدت مندی کی پیدا کردہ نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے جس سے ہم ان کا اثر لے لیتے ہیں۔ آپ انہیں اپنے جیسا انسان سمجھئے پھر دیکھئے ان کا کوئی اثر آپ پر نہیں ہوگا۔[۱] ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خداست

چوں یکے اندر قیام آئی مناست

جہالت کے بعد زندگی کے عملی معاملات آتے ہیں۔ اور ان کا تجزیہ غور طلب ہے۔ آپ دیکھئے کہ انسان اس قسم کے سہارے ڈھونڈتا کب ہے؟ صرف اس وقت جب اس کا کوئی کام رک جائے۔ جب اس پر کوئی مصیبت پڑ جائے۔ جب قاعدے اور قانون کے مطابق چلنے سے اسے کامیابی نہ ہوتی ہو۔

---

[۱] پنجابی زبان کا ایک محاورہ ہے ــــ "پیر منیاں نوں کھانداں اے" ــــ یعنی بزرگ انہی سے کچھ وصول کر سکتا ہے جو اسے پیر مانتے ہیں۔ آپ اسے پیر ماننا چھوڑ دیجئے اس کی ساری بزرگی ختم ہو جائے گی۔ جس قبر کی عقیدت آپ کے دل میں ہوگی، وہ آپ کو عرش معلّے سے بھی بلند نظر آئے گی۔ اس عقیدت کو دل سے نکال دیجئے وہ اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔

لہٰذا اس کا علاج یہ ہے کہ معاشرہ کے نظام میں ایسی تبدیلی پیدا کی جائے جس سے کسی کا کوئی جائز کام رُکے نہیں جس سے کسی کی مصیبت، تنہا اسی کی مصیبت بن کر نہ رہ جائے جس سے قاعدے اور قانون کے مطابق ہر کام آسانی سے ہوتا چلا جائے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا وہ ارشاد اس قدر اہم اور عمیق ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ کا صحیح تصور نگاہوں کے سامنے لے آتا ہے۔ آپ نے لوگوں سے کہا تھا کہ

میں یہاں اس لئے ہوں کہ تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔

اور اس کی تشریح میں آپ نے فرمایا تھا کہ تم خدا سے اسی وقت دعا کرو گے جب تمہارا کوئی کام رُک جائے گا میرا فریضہ یہ ہے کہ میں دیکھوں کہ تمہارا کوئی کام رُکے نہیں۔ جب تمہارا کام رُکے گا نہیں تو تمہیں خدا کے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کسی مشکل کے حل کے لئے اگر تم خدا تک بات پہنچاؤ گے، تو وہ درحقیقت میرے خلاف شکایت ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے قاصر رہا ہوں۔ اس لئے میں ایسا انتظام کروں گا کہ تمہیں خدا کے حضور میری شکایت کرنے کا موقع ہی نہ ملے

اگر ایسا معاشرہ قائم کر دیا جائے تو پھر لوگوں کو اس قسم کے سہاروں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ باقی رہے وہ لوگ جو پیسہ کے لئے یہ کچھ کرتے ہیں تو ان کا علاج بھی اسی قسم کے معاشرہ کا قیام ہے۔ اسلامی معاشرہ میں، کسی شخص کی ضروریاتِ زندگی رُکی نہیں رہتیں، اور ضرورت سے زاید کوئی شخص اپنے پاس رکھ نہیں سکتا لہٰذا جس معاشرہ میں "سیٹھ" بننے کا امکان ہی نہ ہو، اس میں اس قسم کی "میسرانہ" حرکات کی نہ ضرورت رہتی ہے نہ گنجائش۔ اس وقت نہ توہم پرستی باقی رہتی ہے، نہ ہوسِ زر پرستی — یہ دونوں چیزیں درحقیقت غلط معاشرہ کی پیداوار ہیں۔ اسلام کے صدرِ اول میں جب یہ معاشرہ قائم ہوا تھا، نہ کوئی پیر تھا نہ خانقاہ۔ نہ قبروں پر چڑھاوے چڑھائی جاتی تھیں نہ بزرگوں کے عرس ہوتے تھے۔ اس لئے کہ اس میں نہ کوئی بھوکا تھا نہ سیٹھ۔ ان خرافات کے ختم کرنے کا یہی عملی طریق ہے۔ اور دین یہی سکھانے کے لئے آیا تھا۔ اسی سے انسان میں وہ خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے جس سے وہ کسی خارجی سہارے کا محتاج نہیں رہتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

قرآن اسی قسم کے آزاد بندے پیدا کرنے کے لئے آیا تھا جو اپنے معاملات کے لئے، انسانوں کی آستانوں پر جھولی پھیلانے کے بجائے صرف قانونِ خداوندی کے دروازے پر دستک دیتے تھے اور اس قانون کا اتباع ان کی ہر مشکل آسان کر دیتا تھا۔

---(۰)---

چند اہم سوالات

ایک صاحب نے چند اہم سوالات دریافت فرمائے ہیں جن کا ملخص یہ ہے:

(۱) انگریزوں کی حکومت میں مسلمانوں نے اپنے طور پر کئی بڑے بڑے ملی ادارے قائم کئے. مثلاً علیگڑھ یا انجمن حمایت اسلام وغیرہ. لیکن اب اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتا. بلکہ جو کچھ اُس دَور میں بنایا گیا تھا اُسے قائم رکھنے کی بھی فکر نہیں کرتا. اس کی کیا وجہ ہے؟

(۲) حکومت کی طرف سے جو اسکیم سامنے لائی جاتی ہے، لوگ اس سے تعاون نہیں کرتے. بلکہ یوں کہئے کہ لوگ حکومت سے کسی بات میں بھی تعاون نہیں کرتے. نہ ہی اس کا ساتھ دیتے ہیں. ایسا کیوں ہے؟

(۳) لاہور میں "یادگارِ پاکستان" کے نام سے جو مینار تعمیر ہوا ہے اس کا کوئی فائدہ بھی ہے؟

(۰)

جواب

(۱) مسلمان اور ملّی ادارے

انگریزوں کے دور میں، ہم لوٹ میں مشغول نہیں تھے اور نہ ہی ہم میں ہوسِ زرپرستی آئی تھی، اس لئے ہم زندگی کے اہم معاملات کو سنجیدگی سے (SERIOUSLY) لیتے تھے. لیکن جب قوم کے سامنے نصب العین ہی حصول و اکتنازِ زر رہ جائے اور ہر ایک، اپنی اپنی بساط و استعداد کے مطابق، اس دوڑ میں دوسروں سے آگے نکل جانے کے لئے پاگل ہو رہا ہو تو ایسے حالات میں ملّت کے اجتماعی امور کے متعلق سوچنے کی فکر کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ نہیں کہ اس وقت لوگ صرف جمع کرتے ہیں، خرچ نہیں کرتے ہیں. خرچ بھی اس قدر کرتے ہیں جس کا تصور تک انگریزوں کے زمانے میں نہیں کیا جا سکتا تھا. لیکن خرچ کرتے ہیں یا تو ان کاموں پر جن کے متعلق انہیں یقین ہو کہ اس طرح خرچ کیا ہوا روپیہ دگنا چوگنا ہو کر واپس مل جائے گا۔ مثلاً افسروں کی دعوتیں. یا اُن کی اپیلوں پر چندے. یا خرچ کرتے ہیں اپنے تھکے ہوئے اعصاب کے لئے تسکین کا سامان بہم پہنچانے کے لئے.

ایک وجہ یہ ہے. دوسری وجہ اس سے زیادہ گہری ہے. سر سید نے مسلمان کو جھنجھوڑ کر ملّا کے شکنجے سے چھڑایا اور اسے بتایا کہ رفاہِ عامہ سے متعلق امور پر خرچ کرنے سے بھی عاقبت سنور جاتی ہے — بلکہ قرآن کے الفاظ میں، ویمکث فی الارض ما ینفع الناس (۱۳/۱۷) بقا اسی عمل کو حاصل ہوتی ہے جو نوعِ انسان

کے لئے منفعت بخش ہو۔ اس سے قوم کے مخیّر طبقہ کی نگاہ کا زاویہ بدلا اور اس نے قوم کی بہبود کے کاموں میں دل کھول کر حصہ لینا شروع کیا۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم نے پھر زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔۔۔ ایک حصہ کا تعلق امورِ دنیا سے ہے اور دوسرے کا تعلق مذہب سے۔ دنیا سے متعلق امور کی نگہداشت حکومت کا فریضہ سمجھ لیا گیا ہے اور مذہبی امور کا تعلق مذہب پرست طبقہ سے۔ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس قسم کی اپیلیں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ جو شخص دنیا میں اینٹ اور پتھر کی مسجد تعمیر کریگا اللہ تعالےٰ اس کے لئے جنت میں موتیوں کا گھر بنا دے گا۔ یا جو شخص علومِ شریعت کی نشر و اشاعت کے لئے مکتبوں اور دار العلوموں کی امداد کرے گا اس کی عاقبت سنور جائے گی۔ ان کی طرف سے کبھی اس قسم کی اپیل شائع نہیں ہوتی کہ جو شخص اسکول یا کالج کھولنے میں، ہسپتال بنانے میں، یا سائنس کی ریسرچ لیبارٹری کی تعمیر میں حصہ لے گا، اللہ اس کا گھر جنت میں بنا دے گا۔ چونکہ قوم کے دولت مند طبقہ کی اکثریت ناجائز طریقوں سے دولت کماتی ہے اس لئے ان کے دل میں عام طور پر آخروی عذاب کی خلش سی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ ان کاموں پر خرچ کرنے سے جن کے متعلق مولوی کہتا ہے کہ ان سے آخرت کا ثواب حاصل ہوتا ہے وہ اپنی خلش میں تسکین پاتے ہیں۔ یہ تسکین (جسے فریبِ نفس کہنا چاہیئے) انہیں "دنیاوی امور" سے متعلق کاموں میں خرچ کرنے سے نہیں ملتی۔ یہ وجہ ہے کہ پاکستان میں مکتبوں، دار العلوموں اور مسجدوں کی تعداد ہر سال سیلاب کی طرح بڑھتی جا رہی ہے اور رفاہِ عامہ سے متعلق اداروں اور تنظیموں کی حالت خستہ سے خستہ تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ پیری مریدی کے دھندے اور خدا کے نام پر مختلف نوعیتوں کے چندے، معاشی مجرموں کی ضمیر کی خلش کو (EXPLOIT) کرنے کے حربے ہیں۔ اور نہایت کامیاب حربے۔ قوم کے اجتماعی امور سے متعلق اسکیمیں اس قسم کا کوئی حربہ اپنے پاس نہیں رکھتیں، اس لئے ناکام رہتی ہیں۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ صوفی ہے نہ ملّا نہ حکیم

مثال کے طور پر سنیئے۔ لاہور کی مال روڈ پر ریگل چوک کے وسط میں (جو سب سے زیادہ پُر رونق اور مرکزی مقام ہے) ایک قطعہ اراضی خالی پڑا تھا۔ کسی کو دور کی سوجھی اور اس نے تجویز کر دیا کہ وہاں شہدائے پاکستان کی یاد میں عظیم الشان مسجد تعمیر کر دی جائے۔ ہم نے یہ گزارش کرنے کی جرأت کر دی کہ اس قدر اہم مرکزی مقام میں اگر ایک مارکیٹ تعمیر کر دی جائے اور اس کی آمدنی شہدائے پاکستان کے بچوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دی جائے تو یہ اُن شہداء کی بڑی مفید یادگار ہو گی۔ اس پر سینکڑوں مقدس جبینیں شکن آلود اور ہزاروں نورانی آنکھیں خشمگیں ہو گئیں۔ چنانچہ وہ قطعہ اراضی تعمیرِ مسجد کے لئے وقف ہو چکا ہے

اور طلوع اسلام' ملحد و بے دین قرار پا چکا ہے۔

جب فضا ایسی پیدا کر دی جائے تو ملت کے اجتماعی امور کی طرف توجہ دینے کی فرصت کسے ہو سکتی ہے؟ اور اس میں کون اپنا فائدہ محسوس کر سکتا ہے؟

۲۔ حکومت سے تعاون

اب رہا دوسرا سوال۔ یعنی یہ کہ لوگ حکومت کے ساتھ (اچھے کاموں میں بھی) تعاون نہیں کرتے۔

جب ہندوستان میں جنگِ آزادی شروع ہوئی تو چونکہ وہ جنگ غیروں کی حکومت کے خلاف تھی اس لئے اس محاذ پر ایک طرف حکومت تھی اور دوسری طرف قوم۔ جب دو دشمن ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوں تو فریقِ مقابل کے ساتھ کسی معاملہ میں بھی تعاون کرنا، اپنی قوم کے ساتھ غداری کے مرادف ہوتا ہے اس لئے اس وقت عام فضا اس قسم کی پیدا ہو چکی تھی کہ حکومت کی طرف سے پیش کردہ کسی اسکیم کا ساتھ دینا تو ایک طرف، اسے اچھا کہنا بھی قوم کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو جانا تھا۔ اُس وقت کیفیت یہ تھی کہ جس شخص کو معاشرہ میں بدنام کرنا مقصود ہوتا، اس کے متعلق بس اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ وہ حکومت کا آدمی ہے پھر کیا تھا۔ گلی محلے کے لڑکے، "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" کی سینہ کوبی سے اس کا ناطقہ بند کر دیتے۔

انگریز چلا گیا۔ اُس کی حکومت بھی چلی گئی۔ اب حکومت قوم کی اپنی ہے، کسی باہر والے کی نہیں۔ لیکن حکومت کے متعلق جو تصور اُس زمانے میں قائم کیا گیا تھا وہ بدقسمتی سے بدستور موجود ہے۔ اب بھی جس شخص، ادارہ، یا اسکیم کے متعلق کہہ دیا جائے کہ وہ حکومت کی ہے، اسے حکومت کی تائید حاصل ہے، یا حکومت کی طرف سے مدد ملتی ہے، لوگ اُس سے فوراً بدظن ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ حکومت کی طرف سے کیسے ہی مستحسن اقدامات عمل میں کیوں نہ آئیں، ان سے تعاون کرنا تو ایک طرف، کوئی شخص بدنام ہو جانے کے ڈر سے اُسے اچھا کہنے کی جرأت بھی نہیں کرے گا۔

ملک میں غیر شعوری طور پر پہلے سے ہی یہ فضا موجود تھی۔ احزابِ مخالف (اپوزیشن پارٹیز) نے اسے اور ہوا دی۔ یا یوں کہیئے کہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا (اسے EXPLOIT کیا) ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ لوگ حکومت کے ساتھ تعاون نہ کریں اور اس کی ہر اسکیم کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھیں۔ چنانچہ یہ اُنکے پروگرام کا حصہ ہے کہ حکومت کے خلاف وسوسہ انگیزی (WHISPERING CAMPAIGN) جاری رکھی جائے۔ جماعت اسلامی اس باب میں بڑی اکسپرٹ (تجربہ کار) واقع ہوئی ہے۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ

جو شخص ان کا ساتھ دے، وہ ابلیس بھی ہے تو فرشتہ ہے۔ جو حکومت کو اچھا سمجھے یا اس کی کسی اسکیم کی تعریف کرے وہ فرشتہ بھی ہے تو مستوجب جہنم ہے۔ کیا آپ کو مودودی صاحب کا یہ قول یاد نہیں جو انہوں نے ۱۹۶۵ء کے انتخابات کے سلسلہ میں اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ:

> اگر کنونشن مسلم لیگ فرشتہ کو بھی امیدوار کھڑا کرے گی تو ہم اس کی مخالفت کریں گے۔ اور اگر ہماری تائید ایک ہندو بھی کرے گا تو اسے ہماری حمایت حاصل ہو گی۔

جس ملک میں ذہنیت یہ پیدا کر دی جائے، وہاں حکومت کو اچھا کہنے کی جرأت کون کر سکتا ہے۔

لیکن اس باب میں حزبِ مخالف کا پراپیگنڈہ وہ کچھ نہیں کرتا جو کچھ خود بر سرِ اقتدار طبقہ کے نادان دوستوں کے اکثر اقدامات کر دیتے ہیں۔ وہ حکومت کی تائید اور تعریف میں ایسی ایسی مضحکہ انگیز حرکات پر اتر آتے ہیں جس سے حکومت عوام کی نگاہوں میں مقبول ہونے کے بجائے اور زیادہ بدنام ہو جاتی ہے — حکومت جتنی جلدی اس قسم کے نادان دوستوں سے لاتعلقی کا اظہار کر دے اتنا ہی اس کے لئے اچھا ہے، اور ان کے بجائے اپنا ہمنوا ایسے لوگوں کو بنائے جن کے سر میں عقل و ہوش، نگاہوں میں بصیرت، سینے میں پُر خلوص دل، اور دل میں پاکستان اور اسلام کی محبت ہو۔ ان کی سیرت انگشت نمائی سے بلند، اور ان کی شہرت بے داغ ہو۔ یہ ہوں گے وہ اربابِ خرد و خلوص جن کی طرف سے، حکومت کے اچھے اقدامات کی تعریف، قوم کی نگاہوں میں وزن رکھے گی۔

قرآنی نقطۂ نگاہ سے، امت میں مذہبی فرقوں یا سیاسی پارٹیوں کا وجود، بہ نصِ صریح شرک ہے۔ اس لئے یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ملک میں حزبِ مخالف کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے بے لوث حضرات جن کے دل میں پاکستان کے استحکام اور اسلام کی سرفرازی کا جذبہ ہو، کسی پارٹی میں شامل ہوئے بغیر، حکومت کے ہر اقدام کو غائر نگاہ سے دیکھیں۔ اگر وہ قدم مستحسن ہے تو بلا خوف لومۃ لائم کھلے بندوں اس کی تائید کریں اور بحد استطاعت بلا مزد و معاوضہ، اس سے تعاون کریں۔ لیکن جو اس کا قدم، مضر یا غیر مناسب ہو، اس پر مخلصانہ تنقید کریں۔ اور اس میں نہ کسی قسم کی رو رعایت کریں، نہ کسی سے خوف کھائیں۔

اگر قوم میں ایک مختصر سا طبقہ بھی اس قسم کا پیدا ہو گیا اور وہ جرأت کر کے باہر آ گیا تو یہی وہ حضرات ہوں گے جو ملک، و قوم اور اسلام کے سچے بہی خواہ اور حکومت کے مخلص دوست سمجھے جائیں گے۔ اسوقت ملک کی خرابی کا باعث اس قسم کے گروہ کا فقدان ہے۔

———(○)———

۳- یادگارِ پاکستان

مشاہیر کی یادگاریں قائم کرنے کے سلسلہ میں ہم سے اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ دریافت کیا گیا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے جو جواب اُس وقت اصولی طور پر دیا تھا، اسے بار دگر سامنے لے آیا جائے۔ ہم نے طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۶۴ء کے باب المراسلات میں لکھا تھا۔

> اگر کسی شخص نے نوعِ انسان کی منفعت بخشی کا کوئی بڑا کام سرانجام دیا ہے تو اس کی یادگار اس کے اس عظیم کام کی یاددہانی کا ذریعہ ہوتی ہے تاکہ اس سے آنے والی نسلوں کے دل میں اسی قسم کے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، اس قسم کی یادگار قائم کرنا مفید ہوتا ہے۔ جو یادگاریں نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام سے متعلق ہوں، قرآن نے انہیں شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ اسی طرح ایسے عظیم واقعات جو اس سلسلہ میں رونما ہوں ان کی یاد قائم رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ انہیں قرآن کریم نے ایام اللہ سے تعبیر کیا ہے اور ان کی یاددہانی بھی ضروری قرار دی ہے۔ چنانچہ فرعون اور حضرت موسےٰ کی آویزش کے سلسلہ میں کہا ہے۔ وذکرھم بایام اللہ۔ انہیں ایام اللہ کی یاد دلاؤ۔ اگر اس قسم کے اہم واقعات کی یاد کے لئے کوئی عمارت تعمیر کی جاتی ہے تو وہ بھی مفید نتائج پیدا کرتی ہے۔
>
> لیکن اس سلسلے میں ایک بنیادی اصول کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ یادگار ایسی ہونی چاہیئے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ محض ایک ستون کھڑا کر دینا یا مینار بنا دینا جس کی افادی حیثیت کچھ نہ ہو، اسرافِ بے جا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے قومِ عاد کی غلط کاریوں کی جو فہرست پیش کی تھی، اس میں یہ بھی تھا کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ۔ (۲۶/۱۲۸) تم اونچے اونچے مقامات پر ایسی یادگاریں تعمیر کرتے ہو جن کا مصرف کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بیکار عمارت ہوتی ہے۔ تعبثون (ع۔ب۔ث) سے ہے جس کے معنی بے کار، بے غرض و غایت، بے مطلب یعنی عبث ہیں۔

جہاں تک "یادگارِ پاکستان" کے مینار کا تعلق ہے اس میں نہ افادی پہلو ہے نہ جمالیاتی۔ اس لئے وہ بالکل عبث اور دولت کا ضیاع (WASTE) ہے۔ لاہور میں حالت یہ ہے کہ یہاں ایک مرکزی ہسپتال (میو ہوسپٹل) ہے، اور اس ہسپتال میں سینکڑوں مریضوں کو جگہ نہ ہونے کی وجہ سے داخلہ نہیں مل سکتا اور وہ بیچارے بلا علاج

مرجاتے ہیں۔ جو لاکھوں روپیہ اس عبث مینار پر صرف کر دیا گیا ہے، اگر اس سے ایک وسیع و عریض ہسپتال تعمیر کر دیا جاتا، یا کوئی سائنٹیفک ریسرچ سنٹر قائم کر دیا جاتا، وہ تحریک پاکستان کی بہترین یادگار ہوتا۔

لیکن جو قوم، ہر روز لاکھوں گز نیا کپڑا، مُردوں کے ساتھ لپیٹ کر زمین میں دفن کر دیتی ہے[1]، اس نے اگر دو چار لاکھ روپیہ میناروں اور مقبروں پر خرچ کر دیا تو کون سی جائے تعجب ہے! قوموں کی تباہی کی پہلی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس کی عقل و ہوش کے چراغ گل ہو جاتے ہیں اور وہ جذبات میں بہے چلی جاتی ہے۔

(۰)

پرویزی فرقہ کونسا ہے؟

(سابق) سرحد کے ایک گاؤں سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کچھ دنوں سے ایک مولوی صاحب "پرویزی فرقہ" کے خلاف بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ یہ فرقہ کون سا ہے اور اس کے عقاید کیا ہیں؟

طلوع اسلام

آپ نے بھارت (ہندوستان) کی سیاست کا مطالعہ کیا ہے؟ ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ ان کے جس خلاف قانون اقدام کے خلاف پاکستان نے صدائے احتجاج بلند کرنی ہوتی ہے وہ پہلے ہی وہ الزام خود پاکستان کے سر تھوپ کر چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ (مثلاً) وہ کسی دریا کا پانی بند کر لینگے اور اس کے ساتھ ہی دہائی مچانا شروع کر دیں گے کہ پاکستان دریاؤں کا پانی بند کر رہا ہے۔ ہم تباہ ہو گئے، ہم مارے گئے — وقس علیٰ ذالک۔

کچھ ایسی ہی کیفیت ہمارے مولوی صاحبان کی ہے۔ طلوع اسلام پہلے دن سے اس حقیقت کو پیش کر رہا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، اسلام میں فرقوں کا وجود شرک ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۔ (۳۰/۳۱-۳۲)۔ مسلمانو! دیکھنا، تم (ایمان لانے کے بعد پھر) مشرکوں میں سے نہ ہو جانا۔

---

[1] جب حضرت عائشہ رضؓ نے اپنے والد بزرگوار حضرت ابو بکر رضؓ صدیق کے مرض الموت کے زمانے میں ان سے کہا کہ انہوں نے ان کے کفن کے لئے ایک نئی چادر رکھ چھوڑی ہے، تو حضرت صدیق رضؓ نے فرمایا کہ نئے کپڑے کی ضرورت زندہ انسان کو ہوتی ہے مُردہ کو نہیں۔ مجھے میرے انہی کپڑوں میں دفن کر دینا اور نئی چادر کسی زندہ ضرورتمند کو دے دینا۔

یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے (فرقہ بندی میں ہوتا یہ ہے کہ) ہر فرقہ اپنے معتقدات میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس نے رسول اللہ سے کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا ۔ لَسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ (۶/۱۶۰) جو لوگ دین میں فرقے بنا لیں اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھیں، اے رسول! تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

طلوع اسلام شروع سے حضرات علماء کرام سے دریافت کرتا چلا آ رہا ہے کہ قرآن کریم کی ان واضح تصریحات کی روشنی میں، مسلمانوں میں فرقوں کا وجود کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ ان حضرات کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہ تھا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں اپنی مدافعت کی یہ ترکیب سوچی کہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ طلوع اسلام خود ایک فرقہ کا ترجمان ہے جس کا نام پرویزی ہے۔ انھوں نے عوام کو اس پیچ میں الجھا کر اپنا پیچھا چھڑایا۔ یہ ہے حقیقت اس 'پرویزی فرقہ' کی جس کا دنیا میں کوئی وجود نہیں۔

فرقہ اس طرح بنتا ہے کہ لوگ کسی شخص کے قول کو دین میں سند اور حجت سمجھیں۔ یا دوسرے مسلمانوں سے الگ، نماز، روزہ وغیرہ کی کوئی شکل اختیار کریں۔ جہاں تک پرویز صاحب کا تعلق ہے وہ اپنی ہر کتاب میں اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو اور خطا کا امکان ہے۔ میری کوئی بات نہ حرفِ آخر ہے نہ کسی کے لئے سند اور حجت۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ قوم کے افراد قرآن کریم پر غور کر کے اسے سمجھیں۔ جو لوگ ان کی پیش کردہ فکر سے متفق بھی ہوتے ہیں، وہ بھی انہیں قرآن کریم کے ایک مفکر سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو قرآن کریم کے ایک طالب العلم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتے۔

جہاں تک نماز روزہ وغیرہ کا تعلق ہے، طلوع اسلام سینکڑوں مرتبہ اعلان کر چکا ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے جس جس طریق سے اسلام کے ان ارکان پر عمل کرتے چلے آ رہے ہیں، کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل کرے یا ان کی ادائیگی کی کوئی نئی شکل وضع کرے۔ چنانچہ طلوع اسلام کی پیش کردہ فکر سے متفق احباب کو بھی آپ کبھی نہیں دیکھیں گے کہ وہ کسی خاص وضع کی نماز پڑھتے ہوں۔ لیکن اس کے باوجود مولوی صاحبان کہتے چلے جائیں گے کہ طلوع اسلام والے تین نمازوں اور نو دن کے روزوں کے قائل ہیں۔ اس پراپیگنڈہ میں جماعتِ اسلامی کے افراد پیش پیش ہوتے ہیں۔ یہ سب جھوٹا پروپیگنڈہ ہے۔ نہ پرویزی کوئی فرقہ ہے، نہ طلوع اسلام کے کوئی الگ عقاید ہیں۔ نہ ہی یہ روزہ، نماز کی کوئی مختلف شکل تجویز کرتا ہے۔ اس کا مشن کوئی فرقہ بنائے بغیر، قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنا ہے اور بس۔

(۰)

مومن اور مسلم

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ذاتی ملکیت کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے کہا ہے کہ جہاں تک موجودہ مسلمانوں کا تعلق ہے، ان پر قرآن کا معاشی نظام، اسلامی مملکت کی طرف سے قانوناً نافذ کیا جائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ اس طرح قوانینِ اسلام کی اطاعت کریں گے انہیں مومن کس طرح کہا جائے گا کیونکہ مومن تو وہ ہے جو دل کی گہرائی سے دین کی صداقتوں پر یقین رکھے۔

طلوعِ اسلام

قرآنِ کریم نے خود ہی مسلمانوں کی دو قسمیں بیان کر دی ہیں۔ عرب کے بعض بدوی قبائل اسلامی مملکت کی شوکت و عظمت کو دیکھ کر، اس کے مطیع و فرماں پذیر ہو گئے اور اپنے آپ کو مومن کہنے لگے۔ قرآن کریم نے فوراً کہہ دیا کہ ان سے کہو کہ اپنے آپ کو ابھی مومن نہ کہیں، بلکہ یوں کہیں کہ ہم اسلامی قوانین کے سامنے جھک گئے ہیں۔ وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۴۹/۱۴)۔ ایمان ابھی ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ یہ وہ گروہ ہے جو "مسلم" تو ہوتا ہے لیکن "مومن" نہیں کہلا سکتا۔ موجودہ مسلمان جو اسلامی قوانین کی اس طرح اطاعت کرینگے ان کا شمار اس زمرہ میں ہوگا۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو قرآن کی پیش کردہ صداقتوں پر قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ ایمان لاکر حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے ہیں۔ انہیں مومن کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کے فقط ایمان لے آنے سے اس پروگرام کی تکمیل نہیں ہو جاتی۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعد قوانینِ خداوندی کی اطاعت بھی کریں۔ چنانچہ سورۂ روم میں فرمایا کہ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَھُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۳۰/۵۳) اے رسول! تیری بات سننے والے وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی پر ایمان لاتے ہیں اور پھر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے جہاں ایک "مسلم" کے لئے "مومن" ہونا ضروری ہے وہاں ایک "مومن" کے لئے "مسلم" ہونا بھی ضروری ہے۔ موجودہ مسلمان اگر قوانینِ خداوندی کا اتباع (بذریعہ قانونِ مملکت کریں) تو یہ "مسلم" ہونگے اور جب ان کی (یا ان کی آئندہ نسل کی) تعلیم و تربیت قرآنی روشنی میں کی جائے اور اس طرح وہ، قرآن کی صداقتوں پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لے آئیں تو وہ "مومن" کہلا سکینگے جب وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرینگے تو انہیں "مومن اور مسلم" کہا جائے گا۔

مقصودِ اسلام نہ تھا "مسلم" بنانا ہے نہ "مومن"، بلکہ "مسلم مومن" یا "مومنِ مسلم" بنانا۔

(۰)

کیا ناجائز، جائز ہو سکتا ہے؟

ذیل کا خط ملاحظہ فرمایئے:-

"پاکستان میں بڑے بڑے پرہیزگار، پارسا اور شرع کے پابند لوگ بھی سرکاری محاصل مثلاً کسٹم ڈیوٹی، انکم ٹیکس، پراپرٹی ٹیکس اور چنگی وغیرہ کی چوری کو چوری نہیں سمجھتے اور ان محاصل کی تشخیص کے وقت ہر قسم کی غلط بیانی اور ہیرا پھیری کو جائز سمجھتے ہیں۔ جب کبھی ان کے اس طرزِ عمل پر نکتہ چینی کی جائے تو یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ جب تک ہمارا ملکی نظام کتاب و سنت کے وضع کردہ اصولوں پر استوار نہیں کیا جاتا، ٹیکسوں کی چوری شرعاً قابلِ احتساب نہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بلیک مارکیٹ اور سمگلنگ کو بھی شرعاً اور اخلاقاً ناجائز نہیں سمجھتے ہیں۔

براہِ مہربانی قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں ان کے طرزِ عمل کا تجزیہ فرمائیں۔ نوازش ہوگی۔"

طلوعِ اسلام

ہم "اربابِ شریعت" کے متعلق تو کچھ کہہ نہیں سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے جواز کے لئے کوئی راستہ نکال دیں، کیونکہ فقہ کی کتابوں کے ساتھ ایک "کتاب الحیل" بھی ہوتی ہے جس میں وہ طریقے بتائے جاتے ہیں جن سے جرائم کا ارتکاب بھی کیا جائے اور اس پر مؤاخذہ بھی نہ ہو سکے۔ لیکن قرآن کریم کی رُو سے اس قسم کی چوری کیسے جائز قرار پا سکتی ہے؟ اور اس کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں۔ بات صاف ہے۔ غلط بیانی، فریب دہی، خیانت وغیرہ موجودہ حکومت کے قوانین کی رُو سے بھی جرائم ہیں اور یہ چیزیں کتاب و سنت کی رُو سے بھی ناجائز ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کے ان قوانین کی خلاف ورزی، خود کتاب و سنت کی خلاف ورزی قرار پائے گی یا نہیں؟

اگر دلیل یہ لائی جائے کہ جن امور کو کتاب و سنت نے ناجائز قرار دیا ہے ان کا ارتکاب اسی صورت میں ناجائز ہوگا جب ملک میں کتاب و سنت کا نظام قائم ہو، تو بات بہت دور تک جا پہنچے گی۔ (مثلاً) زنا کتاب و سنت کی رُو سے حرام ہے۔ کیا ہمارے یہ "بڑے بڑے پرہیزگار، پارسا اور شرع کے پابند" حضرات آج اس بنا پر زنا کو جائز قرار دیں گے کہ یہاں کتاب و سنت کا نظام قائم نہیں۔ یہاں تو ایک طرف،

یہ تو ہندوستان کی حکومت میں بھی (جہاں کتاب وسنت کے مطابق نظام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا) حرام ہی ہوگا۔

اگر ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو (مذکورہ صدر دلیل کی بنا پر) فی الواقعہ ان امور کو جائز سمجھتے ہیں تو ان کی ذہنیت ان لوگوں کی سی ہو چکی ہے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ زُيِّنَ لَهُ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ۔ (۳۵/۸) ان کی نگاہوں میں، ان کے بُرے کام بھی نہایت مزیّن ہو جاتے ہیں اور وہ انہیں حسنِ عمل بن کر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۔ (۴۷/۲۸) وہ اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور اس طرح انہیں بُرا کام، بُرا کام دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اس قسم کی خود فریبی انسان کی تباہی کی آخری منزل ہوتی ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ جو بُرائی کرے لیکن اسے بُرائی سمجھے، اس کی اصلاح کا تو امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن جسے بُرائی، اچھائی بن کر دکھائی دینے لگ جائے، اس کی اصلاح کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ آپ ان حضرات سے کہیے کہ اگر آپ کی مفاد پرستیاں آپ کو اس قسم کے جرائم پر آمادہ کرتی ہیں اور آپ اُن سے رک نہیں سکتے، تو ہم اس میں کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ اس قسم کی جھک مارنے کے بعد کتاب و سنت کو تو بدنام نہ کیجیے۔

سپاہی کا مقام

فوج سے متعلق ایک صاحب نے پوچھا ہے کہ اسلام میں سب سے بڑا مقام کس کا ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے مسلمانوں میں سب سے بڑا درجہ مجاہد کا ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں اسلامی مملکت کا سپاہی کہا جائے گا۔ اسلام میں داخل ہونے والے کے لئے ایک عہدنامہ پر دستخط کرنے پڑتے ہیں اور وہ عہدنامہ یہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ. يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ .... (۹/۱۱۱)

بلاشبہ خدا نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کا مال، جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر یا تو دشمن کو قتل کر کے (فاتح و منصور لوٹتے ہیں) اور یا میدانِ جنگ میں سر دے کر (اپنے عہد کو پورا کر دیتے اور جنت کے مستحق ہو جاتے ہیں)۔

یعنی سپاہی، فاتح و منصور لوٹ کر غازی بنے یا میدان میں جان دے کر شہید کہلائے۔ دونوں صورتوں میں جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہی جنت میں جانے کا یقینی راستہ ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ آیا ہے کہ

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (۳/۱۴۲)

کیا تم سمجھتے ہو کہ (محض ایمان کا دعویٰ کر کے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی ایسا موقعہ نہیں آیا کہ یہ ظاہر ہو جاتا کہ تم میں سے کون لوگ جہاد کرتے ہیں اور کتنے ہیں جو مشکلات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ مجاہد وہی کہلائے جو میدانِ جنگ میں جائے۔ مجاہد وہ ہے جو جنگ میں جانے کے لئے ہر وقت تیار رہے، یہ الگ بات ہے کہ اس کے لئے جنگ میں جانے کا موقعہ آئے یا نہ آئے۔ وہ دونوں صورتوں میں خدا کا سپاہی ہے اور جنت کے اس وعدے کا مستحق جو خدا نے اس سے کر رکھا ہے۔ مجاہد (سپاہی) کے درجے کو کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا۔

انسانی مسائل کے حل میں

عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں؟
تاریخ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو صرف پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملیگی۔ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطونِ اعظم سے لیکر آج تک گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مؤرخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرین معاشیات و سیاسیات نے کیا سوچا اسے پڑھیئے اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا!

قیمت۔ بارہ ۱۲/ روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ لاہور

میں نے اس درس سے کیا پایا؟

محترم محمد اسلام صاحب۔ نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کراچی

[پرویز صاحب کا ہفتہ واری درس قرآن کریم تو لاہور میں ہوتا ہے لیکن یہی درس بذریعہ ٹیپ ریکارڈر، اسی التزام اور پابندی سے، منعقدہ اسمبلی ہال کراچی میں بھی وجہ بصیرتِ سامعین بنتا ہے۔ یہ درس، بزم طلوعِ اسلام کراچی کے زیرِ اہتمام ہوتا ہے۔

اس درس کا سلسلہ ۲ر جون کو تکمیل تک پہنچا تو بزم کراچی نے بارگاہِ ایزدی میں سجدۂ شکرانہ کے لئے ایک جشن کا اہتمام کیا۔ اس تقریب پر بزم کراچی کے قابلِ فخر نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب نے ایک مقالہ میں بتایا کہ انھوں نے اس درس سے کیا پایا ہے۔ وہ مقالہ بہ مسرت پیشِ خدمت قارئین کیا جاتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)]

حاصلِ عمر ہیں وہی لمحے
تیری محفل میں جو گزار چلے

جناب صدر، خواتین و حضرات!

محترم پرویز صاحب کی عمر کا بیشتر حصہ قرآن کریم پر غور و فکر کرنے اور اس فکر کو دوسروں تک پہنچاتے میں گزرا ہے۔ اس فکر کو دوسروں تک پہنچانے کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ درسِ قرآن کریم بھی ہے۔ قرآن کریم کا مسلسل درس دینے کا سلسلہ موصوف نے ۱۸ر ستمبر ۱۹۶۰ء کو شروع کیا تھا اور الحمدللہ کہ یہ سلسلہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو بحسن و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا ہے جس کا آخری درس آپ حضرات نے ابھی سماعت فرمایا ہے۔

حضرات! انسان کی زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں بیتے ہوئے دنوں کا ماحصل اور آنے والی باقی زندگی کی امیدوں کا سہارا کہا جا سکتا ہے۔ آج کی یہ تقریبِ سعید میرے لئے اسی نوعیت کی حامل ہے۔

آپ اگر مجھ سے پوچھیں کہ میری بیتی ہوئی زندگی کا ماحصل اور باقی زندگی کی امیدوں کا سہارا کیا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ میری بیتی ہوئی زندگی کا ماحصل میرے باباجی (پرویز صاحب) ہیں اور باقی زندگی کی امیدوں کا سہارا قرآن کریم کا وہ خدا ہے جس سے میرے باباجی نے مجھے متعارف کرایا ہے۔

قرآنِ کریم کے خدا سے متعارف کراتے ہوئے پرویز صاحب نے بتایا کہ جب سے انسان میں تمدنی شعور بیدار ہوا، خدا کی طرف سے بوساطت انبیاء کرام وحی کی رہنمائی آنی شروع ہو گئی۔ اس تعلیم کا نقطۂ ماسکہ خدا کے متعلق صحیح تصور تھا۔ لیکن ہوتا یہ رہا کہ ایک رسول آتا، اور خدا کے اس بلند و بالا تصور کو نہایت وضاحت سے پیش کر دیتا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی اور محسوسات کا خوگر انسان الوہیت کے اس صاف و شفاف چشمے میں اپنی ذہنی رنگ آمیزی کرنے لگ جاتا۔ جب ذہن انسانی پر اس طرح شرک کی تاریکیاں چھا جاتیں تو پھر ایک اور رسول آجاتا اور خدا کے اس پاکیزہ تصور کو وحی کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیتا۔ وحی کا یہ سلسلہ اسی نہج و انداز سے جاری رہا، تا آنکہ جب ذہن انسانی اپنے سنِ شعور کے قریب پہنچ گیا، تو خدا کا یہی پاکیزہ اور منزّہ، بلند و بالا تصور ایک مکمل صورت میں قرآن کے اندر دے دیا گیا اور اس صحیفۂ آسمانی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ اس لئے ہم اللہ کے متعلق جو کچھ بھی جان سکتے ہیں وہ اتنا ہی ہے جتنا قرآن بیان کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے ہم خدا کی ذات کو پہچان سکیں یا اس کے متعلق علم حاصل کر سکیں۔

جہاں تک ذاتِ خداوندی کا تعلق ہے اس کی کنہ و حقیقت اور ماہیت و کیفیت کا سمجھنا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں۔ ایک محدود ذہن لامحدود کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ صرف یہ بتایا ہے کہ اس کی صفات کیا ہیں۔ قرآنِ کریم میں مذکور صفاتِ خداوندی ہی اس کی تعارفی تفاصیل ہیں۔ ان ہی کو قرآن کی اصطلاح میں اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے۔ یہی اسماء الحسنیٰ ایک طرف انسان کے لئے زندگی کا نمونہ بنتی ہیں اور دوسری طرف ان کا ظہور اس عالمگیر قانون کی صورت میں ہوتا ہے جو رگِ کائنات میں خونِ زندگی کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے مطالعۂ فطرت اور مشاہدۂ کائنات پر بڑا زور دیا ہے۔ وہ اسے تعارفِ رب کا ذریعہ بتاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مطالعۂ فطرت سے قوانینِ خداوندی بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آجاتے ہیں اور چونکہ قوانینِ خداوندی سے دراصل مراد یہ ہے کہ کن مواقع پر خدا کی کون سی صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لئے مطالعۂ فطرت سے حقیقی مقصود خود

صفاتِ خداوندی کا مطالعہ ہے۔

صفاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ لینا اور (بہ حدِ بشریت) اپنی ذات میں ان کی نمود کو زندگی کا نصب العین قرار دے لینا ایمان باللہ ہے۔

حضرات! پرویز صاحب نے ہمیں قرآن کریم کا جو درس دیا ہے اور اس طرح ہم پر جو احسانات کئے ہیں اس مختصر سے وقت میں میرے لئے یہ تو ممکن نہیں کہ میں انہیں گنا سکوں۔ اس لئے آج کی نشست میں، میں ان میں سے صرف دو کا تذکرہ کروں گا۔

محترم پرویز صاحب کا ہم پر یہ عظیم احسان ہے کہ موصوف نے سیرت محمدیہ کے جگمگاتے چراغ کو توہمات و معتقدات کے دبیز پردوں سے نکال کر اندھیروں میں بھٹکنے والی ـــ روشنی کے لئے مضطرب و بیقرار انسانیت کی ارتقاء کے لئے عام کر دیا۔ پرویز صاحب نے نوعِ انسانی کے اس محسنِ اعظم اور آسمانی انقلاب کے اس داعیٔ اکبر کی سیرتِ مقدسہ کے ایسے گوشوں کو ابھار اور نکھار کر پیش کیا ہے بلکہ یوں کہئے کہ حضورؐ کی عائلی، معاشرتی تمدنی اور سیاسی زندگی کے ہر ہر پہلو کو ایسے دلنشیں انداز میں ذہن نشین کرایا ہے جس سے ہر ذی ہوش اور حساس انسان کے دل میں اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کا حقیقی احترام اور لازوال محبت جاگزین ہو جاتی ہے اور سننے والا بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ اگر قرآن حروف و نقوش کی صورت میں شرفِ انسانیت کی انتہائی بلندیوں کا ترجمان ہے تو سیرتِ محمدیہؐ ان ہی بلندیوں کا چلتا پھرتا حسین پیکر اور دنیا میں قرآن کی تفسیرِ ناطق ہے۔

محترم پرویز صاحب کا ہم پر دوسرا احسان یہ ہے کہ موصوف نے نہ صرف یہ کہ "قرآن مظلوم" پر سالہا سال سے پڑے ہوئے پردوں کو ایک ایک کر کے چاک کیا بلکہ اس عظیم سازش کو بھی بے نقاب کر دیا جس کی رُو سے کہا اور سمجھایا جاتا تھا کہ قرآن کریم نہ مکمل ہے نہ محفوظ۔ اس کی آیات میں نہ ترتیب ہے نہ تسلسل۔ نہ ربط ہے نہ ضبط۔ نہ صرف یہ بلکہ اللہ کی یہ کتاب اپنے معانی و مطالب میں بھی دوسری کتابوں کی محتاج ہے۔

حضرات! محترم پرویز صاحب نے سورۃ الحمد سے سورۃ الناس تک کا درسِ قرآن دے کر روزِ روشن کی طرح یہ ثابت کر دیا کہ روئے زمین پر قرآن کریم سے زیادہ جامع، مکمل، محفوظ، بالترتیب مسلسل اور بالربط کوئی دوسری کتاب نہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ چودہ سو سال میں نہ تو کوئی ایسا مصنف پیدا ہو سکا اور نہ ہی کوئی ایسی تصنیف پیش کی جا سکی جو برحق، نظامِ زندگی کے کسی ایک گوشے کو بھی پیش کرنے میں قرآن کریم کی محتاج نہ ہو۔

حضرات! انسان کی ایسی تصنیف جس کے بغیر قرآن سمجھا ہی نہ جا سکے، یہ تو بعد کی بات ہے، انسان کی تو کیفیت یہ ہے کہ جب یہ اپنے جذبات، معتقدات اور روایات کو اللہ کی اس کتاب کے ساتھ ملا دیتا ہے تو اللہ کی یہی کتاب جو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جانے والی ہے، نور سے تاریکیوں کی طرف

لے جانے کا ذریعہ بنا دی جاتی ہے۔ پھر اس کا مصرف بجائے اس کے کہ یہ نوعِ انسانی کو حیات عطا کرے، جانکنی میں مبتلا انسانوں سے زندگی چھیننے کا موجب قرار پا جاتی ہے۔ غور فرمایئے کہ قرآن اللہ کا نازل کردہ اس کا ایک ایک حرف خدا کا عطا فرمودہ، جب اس میں انسان کے ایک عقیدہ کی آمیزش اسے یہ کچھ بنا کر رکھ دیتی ہے تو کیا آپ کسی ایسی کتاب کا تصور بھی کر سکتے ہیں جس کے بغیر قرآن کا سمجھنا ممکن نہ ہو؟ انسانی تصانیف قرآن کے طالب العلم کو صرف یہ بتا سکتی ہیں کہ فلاں صاحب نے قرآن کو یوں سمجھا تھا۔ قرآن اپنے مطالب کو واضح کرنے میں ان کا محتاج نہیں۔

حضرات! یہ محترم پرویز صاحب ہی کی بصیرتِ قرآنی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے قرآنی مفہوم کو قرآن ہی سے متعین اور واضح کیا ہے۔ پرویز صاحب نے ہمیں اس قرآنِ کریم سے متعارف کرایا ہے جو انسانوں کے جذبات و رجحانات، معتقدات و روایات سے بلند اور پاک ہے۔ موصوف نے ہمیں اس قرآن سے متعارف کرایا ہے ــــ

جو اعلان کرتا ہے "سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ" (۲۳/۹۲) لوگ خدا کے متعلق جو تصورات اپنے ذہن سے پیش کرتے ہیں وہ ان سے بلند اور پاک ہے۔

جو کہتا ہے کہ قانون سازی کا حق کسی انسان کو نہیں۔ انسانوں کے لئے اصولی قوانین اور اساسی آئین صرف ذاتِ خداوندی متعین کر سکتی ہے۔ اس لئے اسلامی مملکت میں حاکمیت کا اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے۔

جو ملوکیت کو خدا کی بدترین لعنت قرار دیتا ہے جس نے ملوکیت کے استبداد کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ کسی انسان کو اس کا حق نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنا حکم منوائے۔ محکومی یا اطاعت قانون کی ہوگی، نہ کہ اشخاص کی۔ انسانوں کو اپنے معاملات قوانینِ خداوندی کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔

جو بتاتا ہے کہ خدا نے اپنے لامحدود قوتوں اور بے انتہا اختیارات کے باوجود ہر کام کے لئے قاعدے اور قوانین مقرر کر رکھے ہیں وہ سب کچھ اُن قوانین کے مطابق کرتا ہے۔ یہ قوانین اس قدر اٹل ہیں کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

جو اعلان کرتا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں خدا کے قوانین از خود جاری و ساری ہیں اور جن کے مطابق ہر شے اپنے اپنے فریضہ کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہے اور اس طرح اپنی ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح انسانی دنیا میں بھی، اسی کے قوانین نافذ العمل ہیں لیکن ان کی کائناتی رفتار بڑی سست ہے۔ اگر انسان کے دست و بازو ان کا ساتھ دیں تو ان کے نتائج انسانی حساب و کتاب کے مطابق مرتب ہو

سکتے ہیں اور اس طرح انسان مشیت کے اس پروگرام میں خدا کا رفیق بن سکتا ہے۔

جو کہتا ہے کہ کائنات کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے۔ اس کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے انسان کے لئے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ ملائکہ ہیں جو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ لہٰذا انسان کا مظاہر فطرت میں سے کسی کے سامنے جھکنا یا کسی سے ڈرنا تذلیل آدمیت اور تحقیر شرف انسانیت ہے۔

جو للکار کر کہتا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا ظن و خیال اور وہم و گمان ہے جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اتنی بڑی حقیقت سے انکار کریں اور دنیا کو باطل اور قابل نفرت قرار دیں تو ان کے اس انکار کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں۔

جو مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ تخلیق ارض و سماء میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنے مشاہدات و تجارب کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے کائنات میں کسی شئے کو بیکار یا تخریبی نتائج کے لئے پیدا نہیں کیا۔

جو انسان کو ایسی زندگی کی بشارت دیتا ہے جس میں انسان نہ بھوکا رہے نہ ننگا۔ نہ اسے پیاس کا خوف ہو نہ مکان کی تنگی کا۔

جو ذات پات کی تقسیم کو طاغوتی قوتوں کا استبداد گردانتا ہے اور تمام قبائلی اور قومی عصبیتوں کو توڑ کر اس انقلاب عظیم کا اعلان کرتا ہے کہ تمام نوع انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے۔ اس لئے تمام روئے زمین کے انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد اور ایک شجر بلند و بالا کی شاخیں ہیں۔

جو اپنے نزول کا مقصد یہ بتاتا ہے کہ وہ ان تمام اختلافات کو مٹا کر دین قائم کرے گا اور فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو ایک امت واحدہ میں تبدیل کرے گا۔

جو ہر انسان کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم قرار دیتا ہے، جو انسان کے مدارج کا معیار اس کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار بتاتا ہے۔ جو کہتا ہے کہ سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جس کی سیرت سب سے زیادہ پاکیزہ اور جس کا کردار سب سے زیادہ بلند ہو۔

جو کہتا ہے کہ سرمایہ داری بجز اس نسبت کہ بعض انسانوں نے قوت فراہم کر کے کمزور و ناتواں انسانوں کے حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ اس لئے تقاضائے عدل و انصاف یہی ہے کہ ان غاصبوں سے غصب شدہ حقوق چھین کر ان کے اصل حقداروں تک پہنچا دیئے جائیں۔

جو اعلان کرتا ہے کہ خدا نے زمین کے دسترخوان پر رزق کو اس لئے بکھیر رکھا ہے کہ اس سے تمام

نوعِ انسان کی پرورش ہو سکے۔ لہٰذا کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ رزق کے سرچشموں پر ذاتی قبضہ جمائے۔ یہ معاشرہ کی تحویل میں رہنے چاہئیں اور انہیں معاشرہ کے تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہونا چاہیئے۔

جو اس حقیقت کو انسانوں پر بے نقاب کرتا ہے کہ زندگی امروز و فردا کے پیمانوں سے ماپنے کی چیز نہیں۔ یہ ایک جوئے رواں ہے جس کے تسلسل اور لامتناہیت کے سامنے کہکشاں بھی گرد ہے۔

جو بتاتا ہے کہ انسان صرف جسم تک ہی محدود نہیں جسم کے علاوہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جسے نفس، ذات، اَنا یا خودی کہتے ہیں۔

جو کہتا ہے کہ انسان کا جسم موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن نفسِ انسان اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

جو اعلان کرتا ہے کہ جس طرح انسانی جسم کی پرورش ہوتی ہے اسی طرح نفسِ انسانی کو بھی نشوونما کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی جسم کی پرورش عقلِ انسانی کے سطحی تقاضوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ لیکن نفسِ انسانی کی پرورش مستقل اقدار کے ماتحت ہوتی ہے۔

جو بتاتا ہے کہ جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے لیکن اس کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی پرورش کے لئے دے۔

جو مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ خود تنگی میں رہتے ہیں اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ بغیر ذاتی غرض کے کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان سے شکریہ تک کے طالب نہیں ہوتے۔

جو کہتا ہے کہ ہر ذات منفرد ہوتی ہے اور ہر عمل کا اثر اس شخص کی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔

جو اعلان کرتا ہے کہ اتباعِ قوانینِ الٰہیہ کا لازمی نتیجہ خوشحالی اور اسبابِ معیشت کی فراوانی ہے اس کے برعکس ان سے روگردانی کا نتیجہ روزی کی تنگی ہے۔

جو بتاتا ہے کہ جو قوم تسخیرِ فطرت میں جدوجہد نہ کرے وہ متاعِ حیات سے محروم رہ جاتی ہے اور متاعِ حیات سے محرومی یا اس کے حصول کے لئے دوسروں کی محتاجگی ذلت کی زندگی اور خدا کا عذاب ہے۔

جو کہتا ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے وحیٔ خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی بہبود کی خاطر استعمال کرنا مقامِ مومن ہے

جو عدل و انصاف کے معاملہ میں اپنے اور پرائے، یگانے اور بیگانے کی کوئی تمیز و تفریق روا نہیں رکھتا۔ جو انصاف اور تقویٰ کا چولی دامن کا ساتھ بتاتا ہے۔

جو عقل و بصیرت اور فہم و فراست کو وجہ شرف انسانیت قرار دیتا ہے اور عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو بدترین خلائق قرار دیتا ہے۔

جو اپنی دعوت کو اندھی تقلید اور عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ علی وجہ البصیرت منواتا ہے۔

جو مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب (اور تو اور) خود ان کے رب کی آیات بھی ان کے سامنے لائی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے گونگے بن کر نہیں گر پڑتے، انہیں عقل و بصیرت سے قبول کرتے ہیں۔

جو سیرت و کردار کی بلندی کو لاینفک قرار دیتا ہے اور سیرت کی بلندی کے لئے خارجی دباؤ استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ اس قسم کا نظام پیش کرتا ہے جس کے اندر یہ خوبی موجود ہو کہ اس کے اتباع سے قلب و نظر میں از خود بالیدگی و پاکیزگی پیدا ہوتی چلی جائے۔

جو اعلان کرتا ہے کہ حسن سیرت کا تعلق نہ عقلی فیصلوں سے ہے نہ رسمی اعمال و کردار سے۔ سیرت کی پختگی اور بلندی دل کی تبدیلی سے متعلق ہے۔ اس کی تمام عمارت قلب کی بنیادوں پر اٹھتی اور استوار ہوتی ہے جب تک نگاہ کے زاویے نہیں بدل جاتے اس وقت تک تطہیر فکر و نظر اور صحیح اعمال ممکن نہیں۔

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں دنیا میرا دل ہے
بدل جانے سے اسکے رنگ ہر اک چیز کا بدلا

حضرات! یہ ہیں محترم پرویز صاحب کی پیش کردہ تعلیمات قرآنی میں سے چند ایک جن سے موصوف نے ہمیں اپنے درس قرآن کے ذریعہ سرفراز فرمایا۔

اس لئے آج مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ دور حاضرہ میں جہاں تک قرآن کریم کو سمجھنے اور سمجھانے کا تعلق ہے پرویز صاحب امت مسلمہ کے محسنین کی فہرست میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

آخر میں بارگاہ رب العزت میں دعا ہے کہ وہ اس مرد درویش کو جس نے ہمیں اندھی عقیدت، کورانہ تقلید، ظن و گمان، توہمات اور فرقہ پرستیوں سے نکال کر قرآن کریم کی روشنی سے ہمکنار کرایا صحت و تندرستی اور عمر دراز عطا فرمائے۔

والسلام!

رابطۂ باہمی

بزمِ لاہور

تحریکِ طلوعِ اسلام کے فروغ کے لئے بزم کے ارکان کی جدوجہد جاری ہے۔ گزشتہ مارچ میں جب محترم پرویز صاحب نے درسِ قرآن کریم کا نیا سلسلہ ایک نصاب کی صورت میں شروع کیا تو اس نادر موقع پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں قرآنی حقائق سے شغف رکھنے والوں کو اس میں شامل کرنے کے لئے نہایت اہتمام سے نشر و اشاعت کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ سلسلۂ درس کے مقابلہ میں ۔ جس کی تکمیل ۱۹۶۷ء کے اواخر میں ہوئی تھی ۔ نیا حلقۂ سامعینِ درس نہ صرف تعداد میں وسیع تر ہو رہا ہے بلکہ اس میں نوجوان طلباء اور معاشرہ کا ذہین طبقہ خاص توجہ سے فاتحۃ الکتاب اور اس کے مابعد کے بنیادی حقائق کو سمجھنے اور قلمبند کرنے کے لئے گوش بر آواز نظر آتا ہے۔ خود مفکرِ قرآن اور سامعین کے جذب کی یہ کیفیت ہے کہ تین ماہ میں درس سورۃ فاتحہ کی کماحقہٗ تشریح کے بعد سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات تک پہنچا ہے۔

حسبِ معمول ۲۱ر اپریل گزشتہ کو بزم کی طرف سے یومِ اقبالؒ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں نہایت تزک و احتشام سے منایا گیا جس میں مفکرِ قرآن کے خطاب کا عنوان "مقامِ آدم" تھا۔ جلسہ گاہ سامعین سے اس قدر پر تھی کہ لوگوں کو باہر گیلری میں بمشکل کھڑے ہونے کی جگہ مل سکی۔ کم و بیش دو گھنٹہ تک مجمع پر ایک وجد آور کیفیت دیکھنے میں آ رہی تھی جو شہرِ لاہور کے یومِ اقبال کے کسی اور جلسہ کو میسر نہ آ سکی۔ افسوس ہے کہ ٹیپ ریکارڈر کے سقم کے باعث اس نادر خطاب کا ٹیپ محفوظ نہ ہو سکا اور دیگر بزموں کے احباب اس سے بہرہ اندوز نہ کئے جا سکے۔

امسال بھی بزم نے عیدِ میلاد النبیؐ کے موقع پر ادارہ کی درس گاہ میں چراغاں کر کے اس تقریب کا شایانِ شان جشن منایا جس میں ارکانِ بزم اور خصوصی مہمانوں کے لئے عشائیہ کا انتظام تھا اور اس کے بعد کلامِ اقبالؒ پر مشتمل ایک شستہ محفلِ شعر و نغمہ آراستہ کی گئی جو کافی دیر تک قائم رہی۔ یہ اجتماع نہایت ہی کیف آور اور فردوسِ گوش تھا۔ اگلے روز ۱۰ ر جون کو سہ پہر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ایک جلسہ کا اہتمام

کیا گیا جس میں مفکرِ قرآن کے خطاب کا برمحل عنوان "پیغامِ انقلاب" تھا۔ یہ خطاب سننے کے لئے بہت سے سامعین وقت سے پہلے ہی جلسہ گاہ میں پہنچ گئے تھے۔ اس معرکۃ الآرا خطاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے ٹیپ پر محفوظ کر لینے کے علاوہ حالیہ شمارہ میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

بزمِ کراچی

بزم کی سرگرمیوں کی ہفتہ وار رپورٹیں باقاعدگی سے آ رہی ہیں۔ اس بزم کے ارکان اپنے نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب کی قیادت میں فی الواقعہ مجاہدینِ تحریک کا ایک رواں دواں قافلہ بن چکے ہیں جو دن رات اپنے نصب العین کے مختلف پہلوؤں پر نہ صرف سوچتے ہیں بلکہ اپنے محدود ذرائع اور نامساعد حالات کے باوجود اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا کرتے ہیں۔ سندھ اسمبلی ہال میں ہفتہ وار درس کا سلسلہ نہایت عمدگی سے چل رہا ہے، سامعین کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کے علاوہ بزم نے ہفتہ کے دوران درس کے ٹیپ کراچی کے مختلف حلقوں میں سنانے کا بھی بندوبست کر رکھا ہے جس کے نتائج حوصلہ افزا ہیں۔

۲۱ اپریل گزشتہ کو بزم نے سندھ اسمبلی ہال میں یومِ اقبال منایا جس میں اراکینِ بزم نے مقالات پڑھے۔ ان میں سے محترم حیات النبی صاحب کا مقالہ "اقبال اور مزدور" عنقریب طلوعِ اسلام میں شائع کیا جائے گا۔ ۱۰ جون کو بزم نے سندھ اسمبلی ہال کی نشستگاہ کو آراستہ کر کے تکمیلِ درسِ قرآن کا نہایت کامیاب جشن منایا۔ اس موقع پر محترم پرویز صاحب کا ایک خصوصی پیغام نشر کیا گیا اور سامعین درس میں سے کئی ایک نے "ہم نے اس درس سے کیا پایا" کے عنوان پر مقالات پیش کئے۔ محترم محمد اسلام صاحب کا مقالہ طلوعِ اسلام کی جانب اشاعت کی زینت دو اوراق ہو رہا ہے۔ ہفتہ وار درس کے علاوہ بھی یہ بزم کثیر تعداد میں پمفلٹس تقسیم کرتی ہے اور ان کی افادیت کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام کے نکلے ہوئے پرچوں کو عنوانات کے لحاظ سے متعدد پمفلٹس میں تبدیل کر لیا جاتا ہے جس سے تحریک اور اس کا لٹریچر روز بروز مقبول ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان احباب کے عزم و ہمت میں اضافہ فرمائے۔ یہ بزم ۲۳ جون کو عیدِ میلاد النبیؐ کی تقریب بھی منا رہی ہے۔

بزمِ راولپنڈی

مفکرِ قرآن کا ٹیپ شدہ درسِ قرآن باقاعدگی سے ہر جمعہ کے روز الکوثر بلڈنگ میں سنایا جا رہا ہے۔ اس

موقع پر ہفتہ واری اجتماعات بزم منعقد ہوتے ہیں۔ پرچے کی تقسیم میں دلچسپی لینے کے نتائج بہت حوصلہ افزا ہیں اور قارئین کا حلقہ وسیع تر ہو رہا ہے۔ بہشتی خریداری کی سکیم کی توسیع کے لئے مزید کوشش جاری ہے۔ تحریک کا لٹریچر قیمتاً اور ہدیۃً دانشمند طبقہ تک پہنچایا جا رہا ہے۔ تحریک کو نئے حلقوں میں پھیلانے کے لئے بزم کے ارکان شب و روز کوشاں ہیں۔

بزم لائل پور

ہفتہ وار درس قرآن بذریعہ ٹیپ حسب معمول جاری ہے اور تحریک کے اہم پمفلٹس اور لٹریچر کی تقسیم نئے حلقوں میں ارکان بزم کے ذریعے سے کی جا رہی ہے جس کے نتائج حوصلہ افزا ہیں۔ سالانہ کنونشن کے بعد سے یہ بزم ایک نئے ولولے سے کام کر رہی ہے جس کا نتیجہ محترم پرویز صاحب کے گزشتہ مارچ میں لائلپور کے ایک نہایت کامیاب دورے کی شکل میں نکلا۔ (اس کی مفصل روئداد ماہ مئی کے شمارے میں آ چکی ہے) یہ بزم ہفتہ وار درس قرآن بذریعہ ٹیپ ۲/۳۴ پیپلز کالونی کے علاوہ لائلپور کے اور حلقوں میں بھی سنانے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔

دیگر بزمیں

بھی اپنے اپنے حلقہ اثر میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا فریضہ تن دہی سے ادا کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی کوششوں میں برکت عطا فرمائے۔

مسلمانوں کی تاریخ کے متعلق تو آپ نے بہت سی کتابیں دیکھی ہونگی لیکن خود اسلام کی تاریخ کیا ہے؟ یہ شروع میں کیا تھا۔ پھر راستے میں اس پر کیا گزری، اس میں کس کس قسم کی آمیزش ہوئی اور بالآخر وہ کیا سے کیا بن گیا ہے۔ اس قسم کی کتاب شاید آپ کی نظروں سے نہ گزری ہو ـــ مصر کے نامور مؤرخ

علامہ احمد امین

نے اس موضوع کو اپنی تحقیق کا مرکز قرار دیا اور ایک سلسلہ کتب شائع کیا ـــ اس سلسلہ کی پہلی کڑی

فجر الاسلام

ہے۔ ادارہ طلوع اسلام نے اس کا نہایت شگفتہ اردو ترجمہ دو حصوں میں شائع کیا ہے۔ قیمت ہر حصہ چار روپے

پتہ ـــ ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور

پرسنتنیب (ریڈیائی تقریر)

صحیح ناپ تول

عید سے ایک دن پہلے کی بات ہے۔ مائی برکتے، ترازو اور چینی لئے بیٹھی تھی کہ اس کی پڑوسن فاطمہ آگئی۔ اس نے کہا کہ پھوپھی کیا کر رہی ہو؟ مائی نے جواب دیا۔ بیٹی کیا کر رہی ہوں۔ ان کی جان کو رو رہی ہوں۔ بچے ضد کر رہے تھے کہ اب کے ہم نے شکر کے ساتھ سیویاں نہیں کھانی، کھانڈ کے ساتھ کھانی ہیں۔ میں نے بمشکل چار پیسے بچائے، دوکان سے جا کر چینی لائی۔ اب جو اُسے تولتی ہوں تو وہ سیر کے بجائے چودہ چھٹانک نکلی ہے۔ ان لوگوں کو خدا کا خوف بھی نہیں آتا جو اس طرح غریبوں کے ساتھ دھوکا کرتے ہیں۔ فاطمہ بولی ___ پھوپھی! نہیں تو پھر بھی تین چار آنے ہی کا نقصان ہوا ہے۔ میری سنو۔ بازار سے پانچ روپے گز کے حساب سے چھ گز کپڑا لائی۔ گھر آ کر اسے ماپا تو ایک نہ دو، آٹھی چار گرہ کم۔ ایک تو سوا روپے کا ویسے نقصان، پھر اس کی بیونت کچھ نہیں بنتی۔ دکاندار سے جا کر کہا تو وہ کاٹنے دوڑا۔ خاموش واپس آگئی کہ کون سب عزتی کرائے۔

یہ رونا مائی برکتے اور فاطمہ بی بی ہی کا نہیں، ہر جگہ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ایک تو کوئی چیز خالص نہیں ملتی۔ اصلی گھی لینے جاؤ تو بناسپتی گھی ملتا ہے۔ تیل لائیے تو وہ سرسوں کے بجائے توریہ کا ہوتا ہے اس پر سیر کا چودہ ہی چھٹانک پلے پڑتا ہے۔ اور یہ سب کچھ وہ مسلمان کر رہے ہیں جن کا ایمان ہے ___ یا کم از کم، وہ زبان سے اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے جہاں پائی پائی کا حساب ہوگا اور عمل کے ذرے ذرے کا وزن ہوگا۔

آپ نے ۲۰ اگست کی شام ہائی کورٹ کی عمارت کو دیکھا ہوگا۔ اس کی چھت پر بجلی کے قمقموں سے ایک بہت بڑی میزان بنائی جاتی ہے جو دور سے جگ مگ جگ مگ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ میزان انصاف کا نشان ہے۔ عدل کو ہمیشہ میزان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ میزان کی اہمیت اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الرحمٰن میں کہا ہے کہ ہم نے کائنات میں عدل کی میزان کھڑی کر رکھی ہے اور اس سے مقصد

یہ ہے کہ تم بھی وزن میں کمی بیشی نہ کرو۔ اس لئے سورۃ حدید میں کہا ہے کہ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا۔ انہیں ضابطۂ قوانین دیا اور اس کے ساتھ میزان بھی نازل کی تاکہ لوگ عدل قائم کر سکیں۔

سورۃ شوریٰ میں ہے کہ خدا نے اس کتاب (قرآن شریف) کو حق کے ساتھ نازل کیا اور اس کے ساتھ میزان بھی اتاری۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ خدا کے نزدیک میزان کی اہمیت کس قدر ہے۔ سورۃ انعام میں مسلمانوں سے تاکیداً کہا گیا ہے کہ تم ماپ اور تول پورا پورا دو اور اس کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے فرمایا کہ تم لوگوں سے کہہ دو کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ۔ تم اس راستے کی پیروی کرو۔ یعنی ماپ اور تول پورا پورا دینا خدا کا حکم اور اس کے سچے رسول کا راستہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ ماپ یا تول میں کمی کرتے ہیں، وہ خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے اختیار کرتے ہیں۔

خدا کی طرف سے جتنے رسول آئے، ان کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان خرابیوں کو دور کریں جو لوگوں میں عام ہوں اور انہیں خدا کے بتلائے ہوئے صحیح راستے پر لگائیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف آئے، اس کی سب سے بڑی خرابی وہی تھی جس کا ذکر ہم نے شروع میں کیا ہے۔ یعنی وہ کم تولتے اور کم ماپتے تھے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام انہیں اس برائی سے روکتے تھے اور تاکید کرتے تھے کہ وہ ماپ اور تول پورا رکھا کریں اور جو لوگوں کو دیں اس میں کمی نہ کیا کریں۔ لیکن حضرت شعیب علیہ السلام کی بار بار تلقین اور تاکید کے باوجود وہ قوم کم تولنے اور کم ماپنے سے باز نہ آئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تباہ اور برباد ہو گئی اور دنیا میں صرف اس کی کہانیاں باقی رہ گئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ کم تولنا، یا کم ماپنا، میزانِ خداوندی میں اتنا بڑا جرم ہے کہ اس سے قومیں تباہ اور برباد ہو جاتی ہیں۔۔ بات ہے بھی واضح —— جو قوم ماپ تول کے معاملے میں بھی دوسرے کا حق مار لیتی ہے وہ بڑے بڑے معاملات میں کیا انصاف کرے گی۔ اور جو قوم انصاف کو چھوڑ دے گی اس کے تباہ اور برباد ہونے میں شبہ کیا ہو سکتا ہے۔ کم تولنے یا کم ماپنے والا خوش ہوتا ہے کہ میں نے گاہک کو دھوکا دے کر چار پیسے زیادہ کما لئے لیکن وہ نہیں سوچتا کہ حرام کی کمائی کا ایک پیسہ باقی ساری کمائی کو اس طرح تباہ کر دیتا ہے جس طرح کھٹی لسی کا ایک چلو، پوری کڑھائی کے دودھ کو پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ جس معاشرے میں کم تولنے اور کم ماپنے کی خرابی عام ہو جائے —— جیسا کہ بدقسمتی سے پاکستان میں آج کل ہو رہا ہے —— وہ معاشرہ خدا کے عذاب سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ ہم اپنے ترازو میں ڈنڈی مار سکتے ہیں لیکن خدا کے قانون کے ترازو میں کوئی ڈنڈی نہیں مار سکتا۔ وہ ایسا "دھرم کانٹا" ہے جو رتی رتی کا حساب کر کے بتا دیتا ہے۔ وہ ترازو

نہ کسی کی رعایت کرتی ہے، نہ کسی کے خلاف جاتی ہے۔ اُس کے قانون کے نتیجے اٹل ہیں۔ اس لئے جو قوم انصاف کے ترازو کو قائم نہیں رکھتی وہ تباہ ہو کر رہتی ہے۔

آپ کہیں گے کہ کم تولنے والے دکاندار۔۔۔ انہیں تباہ ہونا چاہیئے۔ ان کے ساتھ باقی معاشرہ کیوں تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ معاشرہ انہیں اس جرم سے روکتا نہیں۔ اگر ایک شخص نہر کا بند توڑ رہا ہو۔ اور گاؤں والے خاموشی سے بیٹھے تماشہ دیکھتے رہیں، تو جب سیلاب آئے گا تو اُس سے اُس ایک شخص کا گھر تباہ نہیں ہوگا، سارا گاؤں تباہ ہو جائے گا۔ اگر ایک شخص کشتی میں بیٹھا سوراخ کر رہا ہو اور کشتی کے باقی مسافر اُسے اس سے روکیں نہیں تو جب کشتی ڈوبے گی تو تنہا وہی آدمی غرق نہیں ہوگا جس نے کشتی میں سوراخ کیا تھا۔ کشتی کے تمام مسافر ڈوب جائیں گے۔ اس لئے جس معاشرہ میں کوئی جرم عام ہو جائے اور معاشرہ کے لوگ اس کی روک تھام کا انتظام نہ کریں، تو اس سے جو تباہی آتی ہے وہ سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اگر ہم اتنا ہی کر لیں کہ کم تولنے یا کم ماپنے والے سے کوئی شخص سودا نہ خریدے، تو وہ اسی سے سیدھا ہو جائے گا۔ لیکن ہم کم ماپ تول کا رونا روتے رہتے ہیں اور اتنا بھی نہیں کرتے کہ اس سے سودا لینا بند کر دیں۔

اتنی بات اور بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ قرآن شریف نے جو ماپ اور تول پورا رکھنے کی اس قدر تاکید کی ہے تو اس سے صرف سودا سلف میں ماپ اور تول کا پورا رکھنا ہی مقصود نہیں۔ بات اس سے زیادہ وسیع ہے۔ سورۃ تطفیف میں ہے کہ اس معاشرہ پر تباہی آجاتی ہے جس میں لوگوں کی کیفیت یہ ہو، کہ جب وہ دوسروں سے لیں تو پورا پورا لیں لیکن جب دوسروں کو دیں تو جس قدر اُن کا حق بنتا ہے اس سے کم دیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی کے حق میں کمی بیشی کرنا بھی قانونِ خداوندی کی رو سے سنگین جرم ہے جس کا نتیجہ تباہی ہے۔ کسی کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دینا۔ مزدور کو پوری مزدوری نہ دینا، اُس کا حق مارنا ہے۔ یہ بھی انتہائی بے انصافی ہے۔ اس بے انصافی کی بعض شکلیں ایسی ہیں جو ہر ایک کو نمایاں طور پر نظر آجاتی ہیں۔ لیکن بعض ایسی شکلیں بھی ہیں جو محسوس طور پر سامنے نہیں آتیں۔ اور لوگ اس دھوکے میں رہتے ہیں کہ ہم انصاف کر رہے ہیں، حالانکہ وہ درحقیقت انصاف نہیں ہوتا۔ (مثلاً) آپ ایک مزدور کو تین روپے یومیہ پر کام پر لگاتے ہیں اور شام کو اُسے ٹھیک تین روپے دیدیتے ہیں آپ نے (بظاہر) اس سے بے انصافی نہیں کی۔ لیکن جب وہ تین روپے کا آٹا، دال خریدتا ہے، تو وہ اتنا نہیں ہوتا جس سے اس کے بال بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ انہیں کھانے کو کم ملا ہے اس لئے یہ اُس مزدور کے حق میں کمی ہے۔ آپ کہیں گے کہ میرا کام یہ تھا کہ جتنی مزدوری اُس مزدور سے طے ہوئی ہے، اُسے

(باقی صفحہ ۷۰ پر ملاحظہ ہو)

ابوشہاب رفیع اللہ　　(آخری قسط)

منکرینِ حدیث کون ہیں؟

(۲۵) حرمتِ شراب

شراب کی حرمت کے بارے میں قرآن و حدیث کے احکام اتنے واضح اور مشہور ہیں کہ شاید ہی کسی مسلمان کو اس بارے میں شک ہو۔ لیکن فقہ کی کتابوں میں ہم یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ ہمارے فقہاء رحمہم اللہ نے اس کی بعض صورتوں کو جائز قرار دے رکھا ہے۔ خاص طور پر اس بارے میں جو اقوال امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، طبیعت انہیں ماننے پر تیار نہیں ہوتی۔ فقہاء نے اپنے فیصلے کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ شراب صرف وہی حرام ہے جو انگوروں اور کھجوروں سے بنائی جائے۔ باقی جس چیز کی بھی بنائی جائے اور چاہے وہ نشہ آور ہی کیوں نہ ہو، وہ ان کے نزدیک حلال ہے۔

"إِنَّ مَا يَتَّخِذُ مِنَ الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ وَالْعَسَلِ وَالذُّرَةِ حَلَالٌ عِنْدَ أَبِي حَنِيْفَةَ وَلَا يُحَدُّ شَارِبُهُ عِنْدَهُ وَإِنْ سَكِرَ مِنْهُ"۔ [۱]

(ترجمہ) گیہوں، جو، باجرہ اور شہد سے جو شراب بنائی جائے وہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حلال ہے اور اس کے پینے والے پر کوئی شرعی حد نہیں لگے گی چاہے اس کے پینے سے نشہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

یہی نہیں بلکہ جن دو چیزوں (یعنی انگور اور کھجور) کی شراب کی حرمت کو فقہاء نے تسلیم کیا ہے، اگر انہیں ملا کر شراب بنائی جائے تو پھر وہ بھی حرام نہیں رہتی۔

وَلَا بَأْسَ بِالْخَلِيْطَيْنِ لِمَا رُوِيَ عَنِ ابْنِ زِيَادٍ أَنَّهُ قَالَ سَقَانِي ابْنُ عُمَرَ شُرْبَةً مَا كِدْتُ أَهْتَدِي إِلَى مَنْزِلِي فَغَدَوْتُ إِلَيْهِ مِنَ الْغَدِ فَأَخْبَرْتُهُ بِذٰلِكَ فَقَالَ مَا زِدْتُكَ عَلَى عَجْوَةٍ وَزَبِيْبٍ وَهٰذَا نَوْعٌ مِنَ الْخَلِيْطَيْنِ وَكَانَ مَطْبُوْخًا۔ [۲]

---

[۱] ہدایہ مع تکملہ فتح القدیر جلد ۸ صفحہ ۱۶۰، [۲] ایضاً صفحہ ۱۵۹

(ترجمہ) اور انگور اور کھجور کی آمیزہ شراب (خلیطین) میں بھی کوئی حرج نہیں جیسا کہ ابن زیاد سے روایت کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے مجھے ایک مشروب پلایا کہ میں نشہ کی وجہ سے گھر کے راستے سے بھٹک گیا، دوسرے دن ان کے پاس جا کر اس کا ذکر کیا کہ ہم نے تجھے کھجور اور انگوروں کا مسلا ہوا پخت۔ مشروب ہی تو پلایا تھا جو خلیطین ہی کی ایک قسم ہے۔

یہ تو ہم نے صرف ایک دو عبارتیں نقل کی ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں اس باب پر نظر ڈالیے تو صفحے کے صفحے ایسی جواز کی صورتوں سے بھرے ہوئے ہیں اور شاید ہی کوئی صورت بچ رہتی ہو جس میں اس شرعی حد کے نافذ ہونے کا امکان ہو۔ کیا ہمارے علماء قرآن و حدیث کے صریح خلاف ان جواز کی صورتوں کی کوئی شرعی دلیل لا سکتے ہیں؟

(۲۶) شراب اور سرکہ

شراب کو جائز قرار دینے کی ایک صورت یہ نکالی جاتی ہے کہ اس میں تھوڑا سا نمک ڈال دیا جائے تو وہ سرکہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔ ہدایہ میں ہے۔

وَاِذَا تَخَلَّلَتِ الْخَمْرُ حَلَّتْ سَوَاءٌ صَارَتْ خَلًّا بِنَفْسِهَا اَوْ بِشَیْئٍ یُطْرَحُ فِیْهَا وَلَا یُکْرَہُ تَخْلِیْلُهَا وَقَالَ الشَّافِعِیُّ یُکْرَہُ التَّخْلِیْلُ وَلَا یَحِلُّ الْخَلُّ الْحَاصِلُ بِهٖ۔ [1]

(ترجمہ) اگر شراب کو سرکہ میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ حلال ہے چاہے وہ خود بخود سرکہ بن گئی ہو اور یا اس میں کوئی چیز ڈال کر۔ اور شراب کا سرکہ بنانا مکروہ نہیں ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سرکہ بنانا مکروہ ہے اور شراب سے حاصل شدہ سرکہ حلال نہیں۔

اب ملاحظہ ہو کہ احادیثِ رسولؐ اس بارے میں کیا فرماتی ہیں۔ ان کی رُو سے تو شراب کا سرکہ بنانا مطلقاً حرام ہے۔

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ اَنَّ اَبَا طَلْحَةَ سَاَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَیْتَامٍ وَرِثُوْا خَمْرًا۔ قَالَ اَهْرِقْهَا قَالَ اَفَلَا اَجْعَلُهَا خَلًّا؟ قَالَ لَا۔ [2]

(ترجمہ) حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بعض یتیموں کی شراب، جو انہیں وراثت میں ملی تھی، کے بارے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اسے گرا دیا جائے۔ حضرت ابوطلحہؓ نے اسکا سرکہ بنانے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے اس سے بھی منع فرما دیا۔

---

[1] ہدایہ مع تکملہ فتح القدیر جلد ۸ صفحہ ۱۴۴ ، [2] سنن ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۹۳

معلوم نہیں وہ علماء حضرات جو دوسروں پر "منکرین حدیث" کے فتوے لگانے کا شغل اختیار کئے ہوئے ہیں، انہوں نے کبھی ان فیصلوں کو بھی محسوس کیا ہے یا نہیں جو احادیث کے صریحاً خلاف ہیں۔

(۲۷) بادشاہ کے خدائی حقوق

قبیلہ مخزوم کی ایک اونچے گھرانے کی عورت چوری کے الزام میں پکڑی گئی تو اس کو معاف کرانے کے لئے جب حضورؐ کے پاس سفارشیں پہنچی گئیں تو آپ نے منبر نبوی پر رونق افروز ہو کر یہ خطبہ دیا۔

اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِاَنَّهُ اِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ وَاِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ قَطَعُوْهُ وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَوْ كَانَتْ فَاطِمَةُ بِنْتِ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا فَقَطَعَ يَدَ الْمَخْزُوْمِيَّةِ ۔ رواہ احمد ومسلم والنسائی۔[1]

(ترجمہ) تم سے پہلے کی قومیں اس لئے ہلاک ہو گئیں کہ جب ان کا کوئی بڑا چوری کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کم حیثیت کا آدمی اس کا مرتکب ہوتا تھا تو اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم میری بیٹی فاطمہؓ بھی ایسا کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

پس مخزومی عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

اس مضمون کی اور بھی کئی احادیث ہیں جن میں یہ وضاحت موجود ہے کہ جہاں تک شرعی حدود کا معاملہ ہے ان میں شاہ وگدا کا کوئی امتیاز نہیں۔ لیکن جب ہم فقہ کی کتابوں کے ورق الٹتے ہیں تو ہمیں یہ فرق نمایاں ملتا ہے۔ اور ہمارے ہاں بھی وہی کچھ مروج ہو گیا جس سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔ اور بادشاہوں کو اکثر شرعی حدود سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ ہدایہ شریف کی ایک عبارت ملاحظہ ہو۔

وَكُلُّ شَيْءٍ صَنَعَهُ الْاِمَامُ الَّذِىْ لَيْسَ فَوْقَهُ اِمَامٌ فَلَا حَدَّ عَلَيْهِ اِلَّا الْقِصَاصُ فَاِنَّهُ يُؤْخَذُ بِهٖ وَالْمَالُ ۔[2]

(ترجمہ) امام المسلمین جو کسی دوسرے امام کے تحت نہیں (یعنی خود مختار بادشاہ) اگر کوئی جرم کرے تو اس پر کوئی شرعی حد نافذ نہ ہوگی سوائے قتل یا لوگوں کے اموال کے۔

علامہ ابن ہمام صاحب شرح فتح القدیر ان جرائم میں زناکاری، شراب خوری، کسی پر ناجائز تہمت لگانا، یا چوری کا مرتکب ہونا وغیرہ شمار کیا ہے۔ (ایضاً)

---

[1] نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۳۸

[2] ہدایہ مع شرح فتح القدیر جلد ۴ صفحہ ۱۶۰

اب فقہا کا یہ فتویٰ عنوان بالا کی احادیث کے سخت خلاف ہے۔ اب معلوم نہیں ہمارے مولوی صاحبان کس چیز کو صحیح سمجھتے ہیں۔

(۲۸) موسیقی کی حلّت وحرمت

موسیقی کی حرمت کے بارے میں ہمارے مولوی صاحبان جو غلو برتتے ہیں ان سے قارئین واقف ہونگے لیکن یہ بات بڑی تعجب خیز ہے کہ وہ اس کی حرمت کے بارے میں جو احادیث پیش کرتے ہیں وہ ائمہ حدیث کے نزدیک تمام کی تمام ضعیف ہیں۔ علامہ شوکانی لکھتے ہیں۔

وَفِي الْبَابِ أَحَادِيثُ كَثِيرَةٌ وَقَدْ وَضَعَ جَمَاعَةٌ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ فِي ذَالِكَ مصنفات ولكنها ضعيفها جميعًا بعضُ أهْلِ العِلْمِ حتى قال ابنُ حزم لَا يَصِحُّ فِي الْبَابِ حدِيثٌ أَبَدًا وكُلّ مَا فِيهِ فَمَوْضُوعٌ ۔[۱]

(ترجمہ) موسیقی کی حرمت کے بارے میں بہت سی احادیث پیش کی جاتی ہیں اور بہت سے علماء نے اس موضوع پر پوری کتابیں لکھی ہیں لیکن بعض ائمہ حدیث نے ان سب کو ضعیف قرار دیا ہے یہاں تک کہ علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اس بارے میں ایک بھی حدیث صحیح نہیں ہے۔ بلکہ سب کی سب جھوٹی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں بہت سی ایسی احادیث ہیں جو موسیقی کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ ان احادیث کو نقل کرنے کے بجائے ہم شیخ عبدالحق محدث دہلوی، جو خود ہمارے علماء کے نزدیک بھی معتبر ہستی ہیں، کا ایک مختصر سا فیصلہ نقل کرتے ہیں۔ آپ مدارج النبوۃ میں فرماتے ہیں۔

"ایک مسلک تو فقہاء کا ہے جو غنا و مزامیر کے سخت منکر ہیں اور اس معاملہ میں تعصب اور عناد کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ بلکہ اس فعل کو گناہ کبیرہ اور اس کے جواز کے عقیدہ کو کفر، زندقہ اور الحاد سمجھتے ہیں۔ فقہاء کا یہ طرز عمل زیادتی ہے اور اعتدال و انصاف کے مسلک سے باہر ہے۔ دوسرا مسلک محدثین کا ہے جو کہتے ہیں کہ تحریم غنا کے متعلق کوئی صحیح حدیث یا نص صریح موجود نہیں اور جو کچھ ہے تو وہ یا موضوع ہے، یا ضعیف [۲]

اگر دیانتداری سے دیکھا جائے تو احادیث کے ساتھ یہ طرز عمل کہ صحیح احادیث کو چھوڑ کر ان کے مقابلے

---

[۱] نیل الاوطار جلد ۸ صفحہ ۱۰۱ ، [۲] مدارج النبوۃ جلد اول صفحہ ۲۲۵

میں ضعیف اور جھوٹی احادیث کو بنیاد تسلیم کرنا انکارِ حدیث کی سب سے خطرناک صورت ہے۔

(۲۹) انکارِ حدیث کی سب سے خطرناک صورت

جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے، حدیث کے انکار کی یہ سب سے خطرناک صورت ہے کہ صحیح احادیث کو چھوڑ کر ان کے مقابلے میں ضعیف اور جھوٹی احادیث اختیار کر لی جائیں۔ لیکن وہی لوگ جو اٹھتے بیٹھتے دوسروں کو منکرِ حدیث قرار دیتے رہتے ہیں۔ خود اسی اصول پر علی الاعلان عمل کرتے ہیں۔ اس بارے ان کے ارشادات ملاحظہ ہوں فرماتے ہیں:

"جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کون سا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنت نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپؐ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح، روح محمدیؐ میں گم ہو۔ اس کی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اس طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا بہت زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا ... وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اس لئے کہ اس کے جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔"[1]

مودودی صاحب کے ان خوبصورت الفاظ کا خلاصہ وہ فقرہ ہے جس کے نیچے ہم نے خط کھینچا ہے۔ یعنی حدیث کے

---

[1] تفہیمات جلد اول صفحہ ۲۹۶۔

صحیح یا ضعیف ہونے کے لئے اسناد کوئی لازمی امر نہیں۔ حالانکہ ائمہ حدیث کے نزدیک احادیث کی صحت اور ضعف کا سب سے بڑا معیار یہی اسناد ہیں جس کی چھان پھٹک کے لئے ہزاروں ائمہ حدیث نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ لیکن ان حضرات کو اس معیار کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ چاہیں تو جھوٹی حدیث کو صحیح قرار دے دیں اور صحیح کو غلط۔ لاکھوں راویانِ حدیث کی زندگیوں کے حالات جمع کرنے میں جو محنتیں صرف ہوئیں وہ سب بے کار ہو گئیں۔ ان حضرات کا مسلک "منکرین حدیث" سے بھی زیادہ خطرناک اس لئے ہے کہ وہ کسی حدیث کا انکار کریں گے تو اس کے وضعی ہونے کی دلیلیں قرآن مجید سے لائیں گے۔ اور یہ صاحب حضرات اپنے مطلب کے خلاف حدیث کا انکار کریں گے بلکہ اس کے مقابلہ میں کوئی مفید مطلب جھوٹی حدیث نکال لائیں گے۔ اور اگر ہمارے سب فرقوں کے اہل علم اپنے آپ کو مزاج شناسِ رسولؐ سمجھنے لگ گئے تو پھر احادیث کا خدا حافظ ہے۔ اور اسلام کی جو مسخ شدہ صورت سامنے آئے گی، اس کے متعلق کسی پیشگوئی کی ضرورت نہیں۔

(۳۰) انبیاء کے وارث

احادیث کے ساتھ جو سلوک ہمارے علماء کرتے ہیں اس کی تفصیل ابھی ابھی گزر چکی ہے۔ یہ حضرات اپنی بات منوانے کے لئے اکثر و بیشتر ایک حدیث اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ (علماء نبیوں کے وارث ہیں) پیش کیا کرتے ہیں۔ اس حدیث کے ذریعہ عامۃ الناس کے دلوں میں علماء کے لئے عقیدت پیدا کی جاتی ہے۔ تاکہ ان حضرات کے منہ سے جو کچھ نکلے، کسی کو اس سے اختلاف کی جرأت نہ ہو۔ چاہے ان کے ارشادات اسلام کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔

اس مضمون کے آخر میں ہم نے مناسب سمجھا کہ اس حدیث کے بارے میں ائمہ حدیث کی تحقیق نقل کرتے جائیں۔ علامہ شوکانی نے اس حدیث کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

العُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ۔ اَخْرَجَهٗ احمد، وابوداؤد، والترمذی وابن حبّان من حدیث ابی الدرداء۔ [1]

(ترجمہ) علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ اس حدیث کو احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن حبان نے ابو درداء کی روایت سے بیان کیا ہے۔

یہ حدیث ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

---

[1] نیل الاوطار جلد ۱ صفحہ ۱۳۹

وضعفہٗ الدار قطنی فی العللؔ[1] - دارقطنی نے العلل میں ابو درداء کو ضعیف قرار دیا ہے۔
قال المنذری وھو مضطرب الاسناد[2] - المنذری کا کہنا ہے کہ وہ مختلف احادیث کی اسناد میں گڑبڑ کرتا تھا۔

وذکرہ البخاری فی صحیحہ بغیر اسناد[3] - اور امام بخاری نے اس حدیث کو بخاری شریف میں بغیر اسناد کے بیان کیا ہے۔ (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اسناد صحیح نہیں ہیں)

لیکن ہمارے علماء ہیں کہ کس طرح اپنی شان بڑھانے کے لئے ضعیف احادیث کا سہارا لیتے ہیں۔ حالانکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا مشہور فرمان ہے کہ جس نے مجھ پر جھوٹ بولا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

---

[1] نیل الاوطار جلد ۲ - صفحہ ۱۳۹ - [2] ایضاً - [3] ایضاً -

بقیہ "صحیح ناپ تول" صفحہ ۶۹ سے آگے

پوری کی پوری دے دوں، وہ میں نے دے دی۔ یہ دیکھنا میرا کام نہیں کہ جس قدر مزدوری اُسے ملی ہے اس میں اُس کے بال بچوں کا گزارہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ آپ کا کام نہیں۔ لیکن یہ کسی کا تو کام ہونا چاہیئے کہ وہ دیکھے کہ ایک کام کرنے والے کو اتنا مل جائے جس سے اس کی اور اس کے بال بچوں کی ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ یہ کام معاشرہ کا ہے۔ جو معاشرہ، کام کرنے والوں کا معاوضہ اتنا مقرر نہیں کرتا، جس میں ان کی ضروریات پوری ہو سکیں، وہ معاشرہ کام کرنے والوں کے حق میں کمی کرتا ہے۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ جو معاشرہ لوگوں کے حق میں کمی کرتا ہے وہ تباہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ عدل اور احسان کی میزان کو قائم نہیں رکھتا۔ اس میزان کے دونوں پلڑے اُس وقت برابر رہتے ہیں جب کام کرنے والا محنت اور دیانت سے کام کرے۔ اور معاشرہ یہ دیکھے کہ اس کام کرنے والے کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ آپ دن بھر بیلوں سے کام لیتے ہیں تو شام کو یہ بھی تو دیکھتے ہیں کہ بیلوں کو اتنا چارہ مل جائے جس سے اُن کا پیٹ بھر جائے تو کیا ایک کام کرنے والے انسان کا حق اتنا بھی نہیں جتنا ایک جانور کا حق ہے؟ انسانوں کے اس حق کا پورا کرنا خدا کا حکم اور اسلامی معاشرہ کا فریضہ ہے جو معاشرہ ایسا نہیں کرتا وہ اسی طرح تباہ ہو جاتا ہے جس طرح اس کسان کی کھیتی تباہ ہو جاتی ہے جو اپنے بیلوں کو پیٹ بھر کر چارہ نہیں ڈالتا۔ اسی کو خدا کا عذاب کہتے ہیں ۔

نقد و نظر

لحنِ صریر

ہمارے جواں سال و جواں بخت شاعر 'عبدالعزیز خالد' سے حلقۂ طلوع اسلام' ناآشنا نہیں۔ ان کے کلام پر اس سے پہلے' ان صفحات میں' تفصیلی تبصرہ ہو چکا ہے۔ اور انھوں نے شاعری میں جس جدید باب کا اضافہ کیا ہے' اس کے محاسن قارئین کے سامنے آچکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب' ان کی رباعیات پر مشتمل ہے۔ رباعی' (ہمارے نزدیک) مشکل ترین صنفِ سخن ہے۔ اس میں چھوٹی بحر کے چار مصرعوں میں پورا مضمون سمونا ہوتا ہے — بلکہ یوں کہیے کہ آخری دو مصرعوں' بلکہ بعض اوقات' صرف آخری ایک مصرعہ میں' — جناب خالد نے اس میدان میں بھی اپنی منفرد خصوصیات کو برقرار رکھا ہے — بالخصوص یہ خصوصیت کہ وہ جگہ بجگہ قرآن مجید کی آیات اور آثار کو اپنے مصرعوں میں یوں جڑتے ہیں جیسے انگشتری میں نگینہ۔ دو چار مثالیں ملاحظہ فرمایئے اور لطف اندوز ہوجیے۔ کہتے ہیں

شاہا! لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا
یہ دور ہے سرداریٔ محنت کش کا
نیک و بد زندگی کا محور ہے شکم
سن! كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُونَ كُفْرًا

ایک رُباعی یہ ہے:

کر صبر۔ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ
کیا اس نے عبث تجھ کو کیا ہے پیدا؟
قُلْ كُلَّ الْخَيْرِ أَرْجُوا مِنْ رَبِّيْ
مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا

اور یہ —

کیوں غم ہو مجھے إِنَّ اللّٰهَ مَعِيْ مجھ سے رہے ہمکلام روحِ معنی

لَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ہے رازِ فلاح تَرْكَ مَا لَا يَعْنِيْ

اور اس رُباعی کی تو داد نہیں دی جا سکتی۔

پُر سوز و گداز ہے سحر گہ کی دُعا
دل کو کرے اک ولولۂ تازہ عطا!
حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ
قُرْاٰنُ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا

یہی انداز ساری کتاب میں رواں دواں چلا جاتا ہے۔

ایک مقام پر ذرا سی کھٹک پیدا ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

لِلنَّاسِ ضَرَبْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ
مِنْ كُلِّ مَثَلٍ پر ہے اگرچہ ایماں
رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى
مومن ہوں مگر يُشَكِّكُنِيَ الشَّيْطَانُ

رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى۔ (اے میرے نشو و نما دینے والے! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے؟) یہ حضرت ابراہیمؑ کا قول ہے جو قرآن میں مذکور ہے۔ "يُشَكِّكُنِيَ الشَّيْطَانُ"۔ اگرچہ شاعر کا اپنا قول ہے، لیکن قصہ حضرت ابراہیمؑ کی تلمیح سے خیال اس طرف جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں بھی شیطان ہی نے اس قسم کا شک پیدا کیا تھا۔ اس قسم کا تصور ایک نبی کے شایانِ شان نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں احیائے موتیٰ کے متعلق شک نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس پر تو انہیں یقین تھا۔ وہ خدا سے معلوم یہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ طریقہ کون سا ہے جس سے اس قسم کی مردہ قوم دوبارہ زندگی حاصل کر لے۔ اور معلوم اس لئے کرنا چاہتے تھے کہ وہ دل کے پورے اطمینان کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کریں۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس رُباعی میں مناسب ترمیم کر دی جائے۔

بہرحال، کتاب حسنِ معنوی کے ساتھ (حسبِ منشِ خالدی) حسنِ صوری سے بھی مزین ہے۔ اور ان تمام خوبیوں کے باوصف، صرف تین روپے میں، بک لینڈ۔ ۱۲۷ محمد بلڈنگ، بندر روڈ کراچی ۱ سے مل سکتی ہے۔

قرآنی دعوتِ فکر کے حقیقت آفریں شاہکار

۱۔ لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اسکی تعلیم کیا ہے؟ اسکی دعوت کیا ہے قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے، یہ اسکا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علومِ حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ۔ پچاس روپے میں۔

۲۔ اسلام کیا ہے؟

یہ مسائل کی کتاب نہیں، یہ آپکو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں، وہ کس قسم کا معاشرتی معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ قیمت دقسم (اعلیٰ) آٹھ روپے۔ چیپ ایڈیشن۔ چار روپے۔

۳۔ سلیم کے نام

سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے ملا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اسکے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کا جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں قیمت حصہ اول آٹھ روپے حصہ دوم و سوم چھ چھ روپے۔

۴۔ نظامِ ربوبیت

نظامِ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اسکے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے۔ اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت۔ چار روپے۔

۵۔ خدا اور سرمایہ دار

موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصرِ معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قیمت۔ قسم اعلیٰ مجلد۔ نو روپے، قسم دوم۔ پانچ روپے۔

۶۔ سلسبیل

قرآنی بصیرت کا چشمۂ رواں یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقالات کا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ قیمت۔ آٹھ روپے۔

۷۔ بہارِ نو

یہ مقالات کے مجموعہ کا دوسرا حصہ ہے جس سے ذہن میں جلا پیدا ہوتا ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ سستا ایڈیشن۔ قیمت پانچ روپے

۸۔ اسبابِ زوالِ امت

ملا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا ہے اسلئے ہم ذلیل ہیں۔ مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ یہ مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صحیح بات کیا ہے۔ اسے معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔

۹۔ اسلامی معاشرت اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں۔ بچوں کو صحیح اسلام کی تعلیم دینے کے لئے بڑی مفید کتاب ہے۔ اندازِ بیان سلیس اور دلچسپ۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت دو روپے۔

۱۰۔ قرآنی فیصلے زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ جلد اول۔ ۳/۲۵، جلد دوم۔ ۲/۲۵۔ جلد سوم ۳/- روپے

۱۱۔ قرآنی قوانین ایک نہایت جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ وکلاء حضرات اور جج صاحبان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ قیمت ۳/- روپے۔

۱۲۔ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں تمام مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی۔ وہ کیسے مرتب ہوئیں، کن کن مراحل سے گزریں اور آج انکی حالت کیا ہے۔ قیمت ۳/- روپے

۱۳۔ جہاد اسلام کے اہم ترین اور اس کے ساتھ ہی نازک ترین موضوع پر مختصر لیکن جامع کتاب۔ اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جوابات۔ قیمت۔ دو روپے۔

۱۴۔ پاکستان کا معمارِ اوّل ہماری نئی نسل سرسید کے عظیم مقام سے ناواقف ہے۔ اس کی سیرت و کردار اور مسلمانوں کے لئے اس کی خدمات کا تعارف نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بڑی مفید ہے۔ قیمت ۳/- روپے۔

۱۵۔ عربی خود سیکھئے قرآن کریم کو خود سمجھنے کیلئے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اس لئے ایک ایسی مختصر اور سلیس سی کتاب کی ضرورت تھی جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جائیں جس سے قرآن کریم آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ یہ کتاب اس مقصد کے لئے نہایت موزوں ہے۔ قیمت ۴/۵۰ روپے

۱۶۔ مقامِ حدیث وہ کتاب جس نے قرآن کریم اور احادیثِ نبویؐ کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے۔ حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا؟ وہ ہم تک کیسے پہنچیں؟ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے۔ رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے۔ علم حدیث کے متعلق اس ایک کتاب کے اندر اس قدر معلومات ہیں جو آپ کو بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت ۴/- روپے

۱۷۔ الفتنۃ الکبریٰ مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمان کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ قیمت چھ روپے

یہ کتابیں اور پرویز صاحب کی دیگر تمام تصانیف کے ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

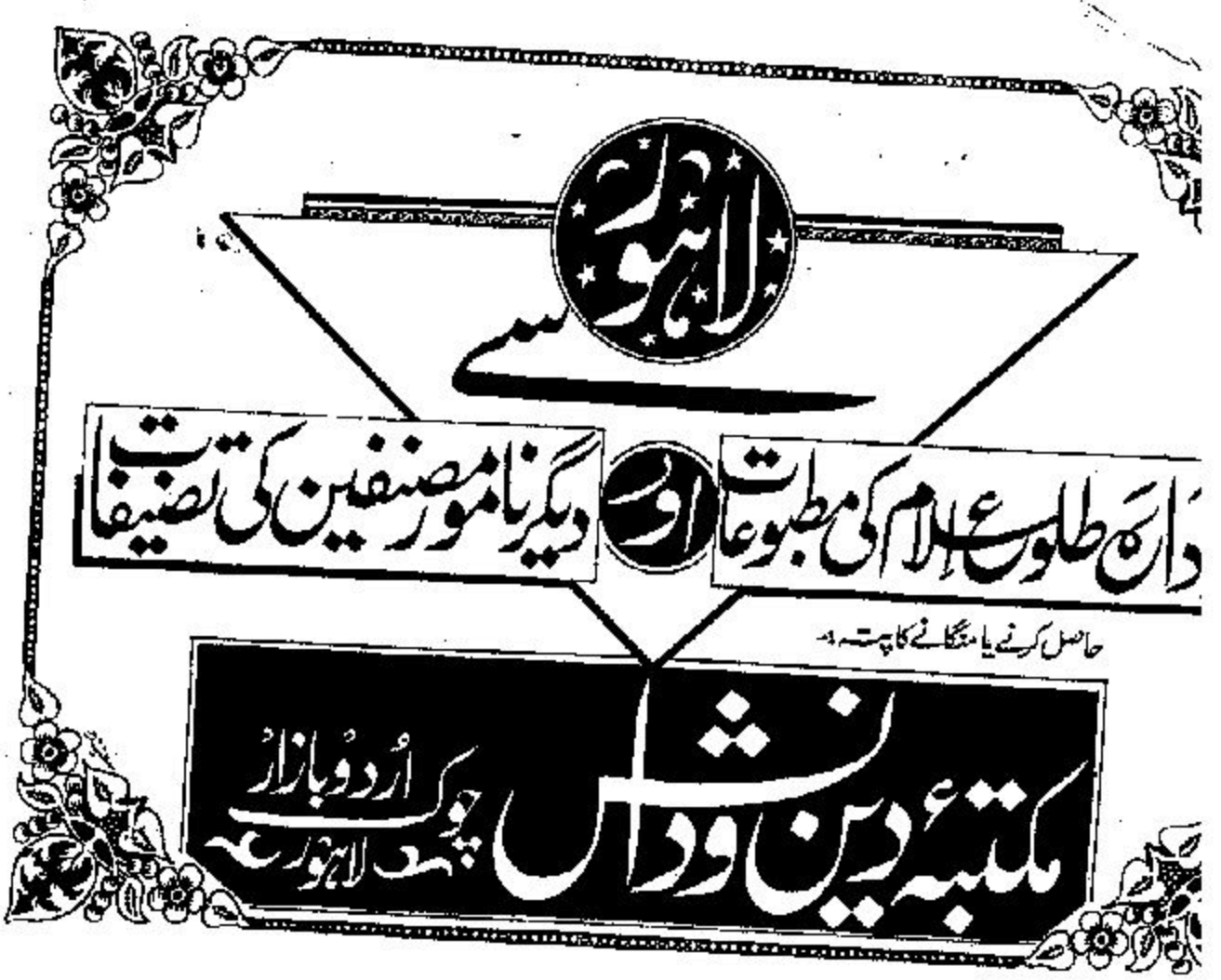

لاہور سے

دارہ طلوع اسلام کی مطبوعات اور دیگر نامور مصنفین کی تصنیفات

حاصل کرنے یا منگانے کا پتہ:-

مکتبۂ دین و دانش

چوک اردو بازار لاہور

معراج انسانیت

سیرت صاحب قرآن - خود قرآن کے آئینے میں
حسن سیرت کی رعنائیاں - خالق حسن کی نگاہ میں

- سیرت طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اس کی تشریح احادیث صحیحہ کی روشنی میں
- ہر واقعہ کی تائید علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رو سے
- غیر مسلموں کے اعتراضات کا مدلل اور مسکت جواب
- دنیا بھر کے ارباب فکر و نظر کا خراج تحسین

بارگاہ رسالت مآب میں

ایک انقلاب انگیز تصنیف ○ ایک عہد آفریں کوشش ○ عشق و خرد کا حسین امتزاج ○

بڑا سائز ○ ضخامت قریب پانچ سو صفحات ○ کاغذ نہایت اعلیٰ ○ مجلد خوبصورت گرد پوش جاذب نگاہ

○ قیمت ○ Rs. 20

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

مکتبہ دین و دانش ۔ چوک اردو بازار ۔ لاہور